

مغل شہزادیاں

مصنف
محمد عسلی
محمود علی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



مغل شہزادیاں

بیاد

مرحومہ والدہ صاحبہ



اکیسویں صدی

کی

خاتون کے

نام

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

مصنف

محمود علی سابق پرنسپل

جملہ حقوق محفوظ

133496

نام کتاب _____ مغل شہزادیاں

مصنف و ناشر _____ محمود علی

اشاعت _____ جنوری ۲۰۰۲ (تعداد، ۵۰۰)

طباعت _____ شوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، دہلی

کتابت _____ حافظ وسیم احمد

قیمت _____ تین سو چالیس (۳۴۰) روپے۔ انتالیس (\$۳۹) ڈالر

تقسیم کار _____ ایپٹ کمپیوٹرس ۲۶۵۲/۵۵ کوچہ چیلان

در، گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۵۳

ملنے کا پتہ _____ محواریہ بلیک اسکول، ۸۰۱۲/۴ گلی نمبر ۹

چوہان بانگر، نیو سیلہ پور، دہلی ۱۱۰۰۵۳

فروری ۲۰۰۲ء February, 2002

دوسرا ایڈیشن

© All Copy Rights Reserved

MUGHAL SHAHZADIAN

By: Mehmood Ali

D-105, Chohan Bangar, Seelam Pur, Delhi-53

January 2002 (Y2k)

Rs. 340/-

ایم۔ آر۔ پبلی لیشنز، دہلی

601، چوڑی والان، جامع مسجد، دہلی-6

2652/55، پہلی منزل، کوچہ چیلان

ریانج، نئی دہلی-110 002

M. R. Publications

- 601, Churi Walan, Jama Masjid, Delhi-110 006.
- 2652/55, 1st Floor, Khajor Lane, Kucha Chelan, Darya Ganj, New Delhi-110 002.

فہرست

| صفحہ نمبر | مضامین | صفحہ نمبر | مضامین | صفحہ نمبر |
|-----------|-------------------------------|-----------|--------|----------------------|
| ۱۵۲ | جانا بیگم | ۱۸ | ۱ | ۱- تمہید |
| ۱۵۳ | ستی النساء بیگم | ۱۹ | ۳ | ۲- مقدمہ |
| ۱۵۵ | دلرس بانو بیگم | ۲۰ | ۳۵ | ۳- گلبدن بیگم |
| ۱۵۶ | بانی بہوت دئی | ۲۱ | ۳۸ | ۴- گل رخ بیگم |
| ۱۵۶ | بی بی بانی | ۲۲ | ۵۰ | ۵- جہاں آرا بیگم |
| ۱۵۶ | رضیۃ النساء بیگم | ۲۳ | ۹۵ | ۶- روشن آرا بیگم |
| ۱۵۶ | نواب زیدۃ النساء بیگم | ۲۴ | ۱۰۰ | ۷- زینب النساء بیگم |
| ۱۵۷ | سلیمہ بانو بیگم | ۲۵ | ۱۱۲ | ۸- زینت النساء بیگم |
| ۱۵۸ | جانی بیگم | ۲۶ | ۱۱۵ | ۹- نور جہاں بیگم |
| ۱۵۸ | عظمت النساء بیگم | ۲۷ | ۱۲۵ | ۱۰- ممتاز محل |
| ۱۵۸ | اختر الزمانی بیگم | ۲۸ | | ضمیمہ (الف) |
| ۱۵۸ | آرزم بیگم | ۲۹ | ۱۳۲ | ۱۱- ماہم بیگم |
| ۱۵۹ | فخر النساء بیگم | ۳۰ | ۱۳۷ | ۱۲- خمیدہ بانو |
| ۱۵۹ | سلطان بیگم | ۳۱ | ۱۴۱ | ۱۳- مریم الزماں |
| ۱۶۰ | موتی بیگم | ۳۲ | ۱۴۴ | ۱۴- جودہ بانی |
| ۱۶۰ | حاجی بیگم اور آرام جانی بیگم | ۳۳ | ۱۴۶ | ۱۵- نواب زینت محل |
| ۱۶۱ | اکبر آبادی یاعزیز النساء بیگم | ۳۴ | ۱۴۷ | ۱۶- سلیمہ سلطان بیگم |
| ۱۶۱ | اورنگ آبادی محل | ۳۵ | ۱۵۱ | ۱۷- ملک بانو |

| نمبر | مضامین | نمبر | مضامین | نمبر |
|------|----------------|------|--------------------------------|------|
| | ضمیمہ (ب) | ۱۶۲ | بائی اودے پوری | ۳۶ |
| ۱۸۹ | رانی پدمنی | ۱۶۲ | اشرف زمانی | ۳۷ |
| ۱۹۱ | رانی تارا بائی | ۱۶۲ | رحمت بانو سگم | ۳۸ |
| ۱۹۶ | رانی روپنتی | ۱۶۲ | جانی بیگم | ۳۹ |
| ۱۹۶ | رانی پاربتی | ۱۶۳ | امتہ الحبیب بیگم | ۴۰ |
| ۱۹۷ | رانی درگاوتی | ۱۶۳ | ارہم یا قدسیہ بیگم | ۴۱ |
| ۱۹۸ | رانی مرگ نینی | ۱۶۳ | چاند بی بی | ۴۲ |
| ۲۰۰ | رانی میرا بائی | ۱۶۹ | بیگم حضرت محل (شان اودھ) | ۴۳ |
| ۲۰۱ | رانی نیل دیوی | ۱۷۹ | صاحب جی (بھارت کی شیردل خاتون) | ۴۴ |
| ۲۰۱ | رانی دینتی | ۱۸۱ | بہو بیگم | ۴۵ |
| ۲۰۳ | | ۱۸۳ | لطف النساء بیگم | ۴۶ |
| | | ۱۸۵ | رضیہ سلطان | ۴۷ |

شہزادوں کی شہزادیوں کا فہرست

جابر

گلبدن بیگم گل رخ بیگم گل چہرہ بیگم احسان بیگم معصوم سلطان مہر جہان

جہانگیر

بہار بانو بیگم

اکبر

شہزادہ خانم بیگم (والدہ عرش آشیانی)

ہمایوں

بخت النساء بیگم

شاہجہاں

جہاں آرا بیگم حور النساء بیگم روشن آرا بیگم گوہر آرا بیگم ثریا بیگم نواب قدسیہ بیگم

محمد اکبر سلطان

رفیقہ النساء بیگم

دراشکوہ

زینب بانو

جانی بیگم

مُعظم سلطان

بچہ بیگم

شجاع

سیلان شکوہ

سلیم بیگم دیند بانو بیگم گل رخ بیگم خیر النساء بیگم دلپذیر بیگم

اورنگ زیب

زینب النساء بیگم زینب النساء بیگم بدر النساء بیگم مہر النساء بیگم بادشاہ بیگم

مُراد

آسائش بیگم ہمزاز بیگم دولتدار بیگم

بہادر شاہ ظفر

• کاشفہ سلطان بیگم • نخی بیگم • آغا بیگم • مبارک النساء بیگم • حسن زمانی بیگم • نواب بیگم • حاجی بیگم • کلثوم زمانی بیگم • نخی بیگم (خود) • حمید زمانی بیگم • ثالث زمانی بیگم • قطبی بیگم • جعفر بیگم • مریم بیگم • رابعہ بیگم • خانم زمانی بیگم • قرینہ سلطان بیگم • سلطان زمانی بیگم • خیر النساء بیگم • ستارہ سلطان بیگم • افسر زمانی بیگم • تہنیت آرا بیگم • ناتون زمانی بیگم

جن شہزادوں کے زندگی کے حالات معلوم ہو سکے ان کو کتاب میں تحریر کر دیا گیا ہے۔

۱
بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

تمہید

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ دور بہترین زمانہ تھا اسی لیے اس کو عہدِ زرین کے نام سے تحریر کیا جاتا ہے، اس دور میں عالی شان عمارات تعمیر ہوئیں بقول مسز بیسٹ ہندوستان پہلے سے زیادہ مالدار بن گیا یہ دور علم پروری طاقت و جبروت مذہبی رواداری مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی اور خوشحالی میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اور یہی وہ امور ہیں جن کے باعث مغل اعظم کی سطوت و جبروت کا سکّہ شاہانِ یورپ پر بیٹھا ہوا تھا، مختلف علوم و فنون نے اس زمانہ میں بے انتہا ترقی پائی، عوام کی تعلیم کے لیے مدارس کھولے گئے، شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اکبر کے فرامین اور اورنگ زیب کے خطوط سے شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا علم ہوتا ہے۔ ان کے لیے قابل ترین معلم مقرر کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادیوں کی کنیزیں تک دماغی نشوونما کی اعلیٰ منازل تک پہنچ گئی تھیں، شہزادوں اور شہزادیوں کو اخلاقی و ذہنی تعلیم کے علاوہ فنونِ جنگ سے بھی مزین کیا جاتا تھا۔ گلبدن بیگم گل رُخ بیگم، نورجہاں بیگم جہاں آرا بیگم، زیب النساء بیگم وغیرہ تعلیم و تربیت، قابلیت، لیاقت، ذہانت، بذلہ سنجی، حاضہ جوابی، شاعری کے لحاظ سے ان بیگمات میں سے ہیں جن پر ہندوستان سدا فخر کرتا رہے گا۔ اور ان کے کارنامے جو انھوں نے محدود محدود میں رہ کر بنی نوع انسان کی ترقی کے لیے انجام دیے تھے، تا قیامت روشن رہیں گے، اُن کا بے لوث زندگی انسانی ہمدردی، زہد و تقویٰ غربا پروری شرافت و لیاقت پاکیزگی وغیرہ۔ ہمیشہ ہمیشہ آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مغل شہزادیوں کے علاوہ کتاب کے ضمیمہ میں ان بیگمات اور ہندو را نیوں کا بھی ذکر لازمی سمجھا جن کے بغیر کتاب مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ انھیں خوانین نے ہندوستانی نسوانی زندگی کو قابلِ رشک

بنادیلے اپنی قابلیت کے جواب دہ دکھا کر اور مردوں کے دوش بدوش کام کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ
 ”عورت کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبان حال سے کہہ رہے ہیں
 کہ عورت کے نازک بازو اور کمزور ہاتھ شیر خوار بچوں کا پنکھوڑہ ہلایا کرتے ہیں
 اور کبھی کبھی یہ ہی ہاتھ قوموں اور سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ
 بھی کیا کرتے ہیں“

کتاب میں ان عظیم خواتین کا ذکر ہے جن کے کارناموں سے صفحات تاریخ درخشاں ہیں۔ ان کا دائرہ
 علم باہر کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس اندرونی دائرہ میں بھی قدم رکھتی ہیں جن سے
 اکثر مورخین نا آشنا ہیں دوسرے مورخین کی طرح وہ باہر کے اسٹیج پر نظر نہیں رکھتیں بلکہ پس پردہ بھی دیکھ
 سکتی ہیں۔

جن خواتین کا کتاب میں تذکرہ ہے ان کے بلند حوصلہ اور آزاد بیانی قابل ستائش
 ہے۔ ایسی خواتین خاندان ملک و ملت اور قوم کے لیے باعث ناز و افتخار ہوتی ہیں، انھیں کی بدولت
 قومیں سنستی ہیں انھیں کے ذریعہ مذہب و ملت کا نام روشن ہوتا ہے انھیں کی بدولت قوموں کے
 بخت جاگ اُٹھتے ہیں اور ادبار نکہت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور شجر امید بار آور ہوتا ہے۔

محمود علی

مقدمہ

اسلامی تمدن نے جہاں اور بہت سے احسان کیے ہیں وہاں اس نے ہندوستانی نسوانی زندگی میں بھی انقلاب عظیم پیدا کر کے اسے قابل رشک بنا دیا ہے۔ قرون وسطیٰ کی بہت سی نسوانی تحریکات اسلامی تمدن کی صدائے بازگشت ہیں اسلام نے عورت کے جائز حقوق تسلیم کرتے ہوئے اس حسین لطیف کو ہر شعبہ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ تیموریہ میں بعض قدسی منش خواتین نے اپنی قابلیت کے جواہر دکھائے۔

قرون وسطیٰ میں عورتوں کی ذہنی ترقی مختلف طبقات میں مختلف ہوتی تھی۔ اعلیٰ طبقہ کی خواتین ایک مہم جویانہ اور غیر محفوظ زندگی بسر کرتی تھیں اسی وجہ سے وہ بہت سے علوم و فنون سیکھنے پر مجبور تھیں افغان خواتین کی جانبازی اور حوصلہ مندی کی دو مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

(۱) ایک موقع پر خواتین نے مردانہ لباس پہن کر دہلی کے قلعہ کو دشمنوں سے بچایا اور دشمن کے تیروں کی بارش کو برداشت کرتی رہیں۔

(۲) کشمیر کے پہاڑی علاقے میں لڑتے ہوئے عورتوں نے تیروں، کمانوں، تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا آخر کار پتھروں کے نیچے دب کر جان دیدی اور اوپر سے دشمن کے تیروں کی بارش ہوتی رہی۔

۱۔ تاریخ داؤدی

۲۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۸۸

دیول لائی درگاوتی، تارا بانی، روپ متی اور میرا بانی ہندو تہذیب کی اچھی مثالیں ہیں۔ حاجی دبیر کا بیان ہے کہ کمایوں پہاڑی پر محمد بن تغلق کے حملے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ وہ ان علاقوں کی عورتوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا جو اپنی شائستگی کے لیے مشہور تھیں۔ رضیہ سلطان کی تخت نشینی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان شاہی خاندان اور امراء اپنی خواتین کو بہترین تعلیم سے بے بہرہ نہیں رکھتے تھے مغلوں کے دربار میں خواتین کی تعلیم و تربیت نے اور زیادہ فروغ پایا۔

گلدن بیگم کا بیان ہے کہ ”ہمایوں کے شاہی حرم کی خواتین مرد دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ آزادی سے ملتی جلتی تھیں بعض اوقات یہ خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے باہر جاتی تھیں پو پو کھلتی تھیں اور موسیقی سے دل بستگی کرتی تھیں وہ غلیل کے استعمال اور دیگر فنون لطیفہ کی بھی ماہر تھیں“

احمد زکی آفندی (مصر کا باشندہ) اپنے سفر نامہ السفرا لی الموتر میں بیان کرتا ہے کہ ”پیرس جو فرانس کا دار السلطنت ہے اس کی تعریف کرتا ہے کہ پیرس میں جو دائرہ عرفان کا مرکز ہے عالم کا سیرگاہ عظمت و شان و شوکت کی تصویر نزاکت و لطافت کا پیکر علوم و فنون کی جان ہے اور بہشتوں کی بہشت ہے وہاں کی عورتوں کی حالت پر تعجب کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ نوع انسانی کا نصف حصہ عورت جو ہمارے ملک میں بالکل بے کار چیز ہے یہاں وہی تمام ترقیوں کی روح ہے اور اس کی اس قدر عزت کی جاتی ہے کہ فرانس کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ ”جو عورت کی مرضی ہے وہی خدا کی مرضی ہے“ وہ آگے بیان کرتا ہے کہ تمام علوم و فنون میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرتی ہیں یہاں تک کہ انشا پردازی، مضمون نگاری، شاعری، مصوری، وکالت، طباعت ایجاد صنائع ان تمام فنون میں اعلیٰ درجہ کی کامل عورتیں موجود ہیں تاہم اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یورپ میں جو عورتوں کو آزادی حاصل ہے وہ سخت اعتراض کے قابل ہے۔“

عہد نبوی میں جو درجہ عورتوں کو حاصل تھا آج ناپید ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسلام میں مرد کی طرح عورت کے ایمان اور عمل کو ہی اس کا انفرادی معاملہ قرار دیا گیا ہے اس کے اعمال کا شوہر، بھائی اور باپ سے کوئی لینا دینا نہیں۔ سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر نبیؐ کو ہدایت کی ہے کہ اپنی ازدواجی مطہرات سے کہو کہ گھروں میں شائستگی سے رہا کریں اور نامحرموں کے ساتھ نگاہیں نیچی کر کے بات کریں۔ گھر کی بیویوں بیٹیوں اور پاکیزہ عورتوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ گھر سے نکلتے وقت جل باب ڈال لیا کریں۔

قرآن اس بات کا برملا اعلان کرتا ہے کہ اسلامی تحریک عورتوں کی شرکت کے بغیر نامکمل ہے۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں عہد نبویؐ کی بیشتر مثالیں ملتی ہیں جہاں عورتیں درس و ارشاد کے منصب پر فائز رہیں خارجی امور میں میدان جنگ میں عورتوں نے فوج کی سپلائی لائن کے طور پر کام کیا۔ امت کے ہر سیاسی اور سماجی پروگرام میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ عہد نبویؐ میں سنگین دور ایسا بھی آیا جب حضرت عائشہؓ کو جنگ جمل میں کلی طور پر کمان سنبھالنی پڑی اس جنگ میں ایک طرف سیدہ عائشہؓ تھیں اور دوسری طرف حضرت علیؓ تھے، ایک بار حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک باغ کا تنازع کھڑا ہوا تو حضرت عائشہؓ نے ماثل طور پر اپنے حق کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی اسلام کی آمد سے غلام اور عورت کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے دونوں کو ہی مکمل انسانیت کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ایک بار جب اسلامی لشکر رسولؐ کے احکام بجالانے میں پیش پیش کا مظاہرہ کر رہا تھا تو پریشانی کے عالم میں آپ اُم سلمہؓ کے خیمہ میں تشریف لائے اور اُم سلمہؓ کے مشورہ سے بحرانی کیفیت ختم ہو گئی۔ ثابت یہ ہوا کہ اچھی بات مرد کی ہو یا عورت کی مفید ثابت ہوگی۔

خلفہ راشدین کے عہد میں بھی عورتوں کے مشورہ کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ خلفہ کے انتخاب میں بھی عورت کی رائے شامل رہتی تھی لیکن آج کے سماج اور سیاست میں فیصلہ کا کلی اختیار مرد کو ہی ہے، عورت کا کردار مرد کے تابع رہا ہے عورت اور پسماندہ طبقہ ہمیشہ حاشیہ پر ہی رکھا گیا۔

یہ بات دیگر ہے کہ مرد نے اپنی عزت اور تاج و تخت بچانے کے لیے عورتوں کو قربان کیا قربانی نہیں کہا جاتا اگرچہ عورت جنگ سے نفرت کرتی ہے مگر مرد کی خاطر وہ اپنے بیٹوں کو قربان کر دیتی ہے قوموں کے عروج میں عورتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں مگر جب زوال ہوتا ہے تو عورت ہی کو زوال کا سبب بنا دیا جاتا ہے حالانکہ قتل و غارت گری سے اس طرف ٹوٹنا عورت کی فتح ہے مرد کی نہیں۔ اگر مرد اور عورت مل جل کر معاشرہ کے استحکام اور ترقی کے لیے مشترکہ طور پر اپنے اپنے میدان میں باہمی ربط و ضبط سے کام کریں تو مہذب اور شائستہ معاشرہ تعمیر ہو سکتا ہے اور زندگی کی عظیم ترین بلندیاں حاصل کر سکتا ہے۔

دراصل دنیا کے جتنے مسلم ممالک ہیں ان کی اپنی روایت اور ثقافت ہے اسلام ایک آفاقی عقیدہ ہے لیکن ثقافت ہمیشہ زمین سے اگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج مسلم عورت ارض فارس سے مشرق وسطیٰ تک اور افغانستان سے کشمیر تک ثقافتی غلامی کا شکار ہے۔

عورت بیٹی کی شکل میں نسلوں کا درد بھگتی ہے مذہب کی سازش اور تہذیب کا جھوٹ برداشت کرتی ہے خاندان کی غربت بھائی کی بیکاری اور والدین کی بیماری کو جھیلی ہے شرابی اور جواہری شوہر کے استبداد تلے جیتی ہے۔ مگر اتنے پرکھی کبھی گیس سیلنڈر بھٹ جاتا ہے اور کبھی مٹی کا تیل اپنا کام کر جاتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ان پر عمل نہیں کیا جاتا وہ آج بھی مرد کے مظالم اور احکامات کا تختہ مشق بنی ہوئی ہے۔

اسلام امن و آشتی حق و انصاف کا علمبردار ہے اسلام سے پہلے نیکیوں نے معاشرے سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا۔ عورت پر ظلم و زیادتی کی انتہا ہو چکی تھی۔ اسلام کا ظہور ایسے دور میں ہوا جب پوری انسانیت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی کہیں بت پرستی کہیں شرک اور کہیں دور وحشت، مصر، بابل، ہند، چین، یونان اپنی تہذیبوں کی شمع گل کر چکے تھے۔ روم فارس اپنی اپنی تہذیب کی عظمت کو تو بلند کر رہے تھے مگر ان تہذیبوں کی چمک دمک (مگر چاندنی) آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی مگر ان کے شیش محلوں میں بدترین مظالم کا دور تھا زندگی بے زخموں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ جاگیردار اور مذہبی طبقہ کی ملی بھگت نے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔

حکمران خدا بنے ہوئے تھے انسانوں بالخصوص عورتوں سے جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے مسائل سے بالادست طبقہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی اعلیٰ طبقہ کی عیاشی اور نفس پرستی نے اخلاقی روح کو ہلاک کر دیا تھا۔ حکومتیں آتش کدوں اور کلیساؤں میں بدلتی رہتی تھیں۔ بار بار بغاوتیں اٹھتیں کشت و خون اور خوں ریزی ہوتی رہتی تھی۔ عورت کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں وہ ایسے آہنی قفس میں بند تھی جس میں کسی بھی طرف وزن نہیں کھتا وہ صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتی تھیں۔

یونان میں عورت کو نجاست کا مجسمہ اور شیطان کی بیٹی سمجھا جاتا تھا اور دیگر اشیاء کے ساتھ بازاروں میں بیچی اور خریدی جاتی تھی۔ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا نکاح اور طلاق کا پورا اختیار مرد کے ہاتھ میں تھا۔ عام یونانیوں کا خیال تھا کہ سانپ کے ڈسنے اور آگ کے جلنے کا تو علاج ہے مگر عورت کے زہر کا کوئی علاج نہیں۔ رومیوں کا خیال ہے کہ عورت کی بیڑی کبھی کھولی نہیں جاسکتی اور نہ اسے آزادی دی جاسکتی ہے۔ دور جاہلیت میں عرب میں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی، لڑکی کی پیدائش پر گھر میں صف ماتم بچھ جاتا۔ عورتیں وارثین میں تقسیم ہوتی تھیں۔ معاشرے میں عورتوں کی خرید و فروخت عصمت فروشی، حسن و جمال اور محبت و وصال کا تذکرہ معیوب نہیں تھا، یہودی بھی عورت کو شیطان کی سواری اور بچھو مانتے تھے۔ ہندو مذہب میں بھی عورت ہر اختیار سے محروم تھی شوبہ کے ساتھ عورت کو سستی ہونا پڑتا تھا یہ رواج ہند میں آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔

اسلام حقیقت میں ضیاء حیات ہے اسلام نے عورت کی عظمت و عزت کو بام عروج پر پہنچایا، جبکہ اسلام سے پہلے وہ ذلت و رسوائی اور حقوق تلفی کی شکار تھی۔ اسلام نے عورت کو وہ سب حقوق دیے جو عقل و انسانیت کی رو سے اسے ملنے چاہیے، اسلام نے عورت کو ماں بہن، بیٹی اور بیوی ہونے کی حیثیت اور ہر حالت میں اس کا جائز حق دلایا اور ہر طرح اس کے وقار و عزت اور قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔ اس کی عفت و عصمت کا تحفظ کیا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے بچایا حضور اکرمؐ نے فرمایا جس نے دو یا تین بچیوں یا دو یا تین بہنوں

کی شادی تک پرورش کی یا انھیں چھوڑ کر مرا تو میں اور وہ جنت میں دو انگلیوں کی طرح ساتھ ہوں گے۔ اسلام نے والدین کے ادب و احترام پر زور دیا ہے۔ اور ماں کے احترام کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اور الجنة تحت اقدام ملاقات (یعنی ماں کے قدموں تلے جنت ہے) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرکم خیرکم لاهلہ وانا خیرکم لاهلی یعنی تم میں اچھا وہ ہے جس کا سلوک اپنے اہل و عیال سے اچھا ہو،

اسلام نے عورتوں کو علم حاصل کرنے کا حق ہی نہیں بلکہ اس پر فرض قرار دیا: ”طلب العلم فریضۃ علی کلّ مسلم“ عورت کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کا اختیار دیا اور اس کو میراث میں حصہ دیا اور طلاق کی آخری حد میں مقرر کر کے عورتوں پر احسان عظیم کیا، جاہلیت کے دور میں طلاق کی تعداد سو تک پہنچ جاتی تھی اور مرد اسے رجوع کر لیتا۔ ظالم شوہر سے اسے کبھی چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس دور میں عورت کو سکون و اطمینان نصیب نہیں تھا۔

آج پوری دنیا خاص طور سے یورپ میں ”آزادی نسواں“ مساوات نسواں، کانفرہ لگایا جا رہا ہے اور اخبارات اور بے شمار کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں اور بہت سی کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہوئے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے عورت کو چار دیواری میں قید کر رکھا ہے اور اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا ہے یہ سراسر غلط پروپیگنڈہ ہے آج مغربی معاشرہ جن مصائب و آلام، اضطراب و بے چینی اور افراتفری کا شکار ہے۔ اس کا حل تو اسلام میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ناکامی ہی ملے گی۔

یورپ کے عالم کی حیثیت کو تو جانتے ہیں مگر وہاں کے سماج میں عمل دکھائی نہیں دیتا۔ معروف مصنف ژول کا قول ہے کہ ”عورت کو چاہیے کہ عورت ہی بنی رہے۔۔۔۔۔ اسی میں اس کی کامیابی ہے،“ مگر مرد بننے کی جس میں وہ اپنے ہی کو بھول گئی۔ اگر عورت قدرت کے قانون کے مطابق چلے گی تو وہ قدرت کے قریب ہوگی۔ عورت پن کی خوبی ہی اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ اس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی، ذلت اور رسوائی سے بچ جائے گی۔ تمام یورپ کے علماء و تمدن کے اس نقصان پر غور کر رہے ہیں، جو قدرتی قانون پر عمل نہ کر کے ہو رہا ہے۔

قدیم جاہلیت نے عورت کو جس پستی کے گڑھے میں پھینک دیا اور جدید جاہلیت نے اسے آزادی کا لالچ دے کر جس ذلت سے دوچار کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ قدیم جاہلیت نے اسے زندگی کے حق سے محروم کیا تو جدید جاہلیت نے اسے زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش چلنے کی ترغیب دی اسے گھر کی چار دیواری سے نکال کر شمع محفل بنا دیا عورت اپنی عزت کھو بیٹھی آزادی کے نام پر غلامی کا شکار ہو گئی آج مغربی عوام میں عورت اس غلامی بنام آزادی سے تنگ آچکی ہے۔ کیوں کہ مغربی تمدن میں اسے بے جا آزادی کے نتائج بے حیائی کی شکل میں رونما ہو رہے ہیں۔ افسوس آج مسلمان عورت بھی اسی آزادی کے حصول میں سرگرداں نظر آتی ہے۔

عورت کے اعلیٰ کردار تعلیم و تربیت کا اس کی اولاد پر براہ راست اثر پڑتا ہے جس سے معاشرہ وجود میں آتا ہے جس طرح پاکیزہ معاشرہ ہوگا اتنی ہی عورت عزت و احترام کے ساتھ قدر و منزلت کی بلندی کو پا کر اپنے ابدی گھر "جنت" کے اعلیٰ مقام کی مالک بنے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"میں تمہیں نازک آگینیوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں یعنی خواتین تم میں سے بہتر وہ ہے جو ان کے ساتھ عزت و تکریم کے ساتھ رہنے والا ہو اور تم میں سے بد بخت وہ ہے جو ان کے ساتھ اہانت سے پیش آتا ہو"

اسلام میں عورت مرد کے برابر ہے ان میں جسم کی ساخت کے سوا کوئی فرق نہیں وہ دونوں کائنات کو دوام بخش نے کے لیے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں حقوق و فرائض اور آزادی قول و فعل میں دونوں برابر ہیں۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو فوقیت عورت ہی کو حاصل ہے اسکے لطیف احساسات نزاکت طبع اور بھاری ذمہ داریوں کے باعث

اسلام نے عورت کی قدر و منزلت کے دعوے ہی دعوے نہیں کیے بلکہ علم و عمل میں تدبیر میں سیاست میں بہادری اور شجاعت میں تہذیب و تمدن میں غرض عورتوں کے چند خصائل کے علاوہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اپنی عملی حیثیت سے مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا ہے اگر اس نے مردوں کی صف سے خلفائے راشدین جیسے مجموعہ حسنات - ہدایت کو دنیا کے لیے پیش کیا ہے تو عورتوں کی جماعت سے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت فاطمہ الزہراءؓ جیسی خواتین کو زہد و تقویٰ نیکی اور پارسائی علم و عمل کے قابل تقلید نمونے بنا کر اقوام عالم کے لیے روبرو عبرت و بصیرت کی غرض سے پیش کر دیا۔ سورہ بقرہ ۱۸۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهِنَّ۔ ترجمہ وہ تمہارے لباس ہیں تم ان کے لیے لباس ہو۔ گویا قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ مرد کی زندگی میں بہت سے ایسے تشنہ پہلو ہیں جن کی آسودگی کا سامان عورت ہی فراہم کر سکتی ہے اور عورت کی زندگی کے متعدد گوشے مرد کے بغیر محتاج تکمیل رہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن پاک نے کہا ہے کہ یہ رشتہ غصہ اور نفرت کا نہیں الفت و محبت کا رشتہ ہے اس کی ترکیب دشمنی و عداوت کے عناصر سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں محبت اور چاہت تحلیل کی گئی ہے یہ تعلق بغض و کینہ کی تخم ریزی کے لیے نہیں بلکہ دل بستگی اور شفقت کی نشوونما کے لیے وجود میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بھی بتاتا ہے کہ زندگی کی گہما گہمی اور نشیب و فراز میں ہمیشہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون اور مددگار رہا ہے زندگی کے بارگراں کو دونوں نے سنبھالا ہے تمدن کا ارتقا دونوں کے اتحاد سے عمل میں آیا ہے دنیا کی کوئی قوم ان میں سے کسی بھی طبقہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس طرح حق کے فروغ اور اس کے غلبہ و اقتدار میں مرد و عورت دونوں شانہ بشانہ مصروف عمل نظر آتے ہیں اسی طرح باطل کی ترقی اور استحکام میں بھی دونوں حصے دار ہیں اور شریک کار ہیں۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت کو بڑھاوا دینے میں عورت اور مرد نے

مساوی حصہ لیا ہے عورت کی نفاست پسندی فطری ملامت اور حسن مذاق کے بغیر سماجی دنیا نامکمل ہے اور جب کہ مرد کی خود اعتمادی جولانی اور دلیری کے بغیر عورت کی حیثیت بھی ادھوری ہے گویا باغ ہستی کی رونق کے لیے مرد اور عورت لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام کی حیثیت سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں مگر شہری حقوق کی نوعیت عورت کے لیے کسی قدر بدل جاتی ہے کیوں کہ اسلامی قانون کے مطابق مرد کو مرد عورت کو عورت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ عورت وہ ہر کام نہیں کر سکتی جو مرد کر سکتا ہے دونوں کے کام بھی الگ الگ ہیں عورت اور مرد کے قدرتی رجحانات میں فرق ہے دوسرے عورت نو گھر کے ذمہ داریوں سے لدی ہوئی رہتی ہے یہ سراسر نسا انصافی ہے اور ستم ظریفی کہ عورت مرد کے کاموں کو بھی انجام دے دونوں کے حقوق و فرائض بھی جداگانہ ہیں عورت بھی مرد کی طرح اپنا وقار اور قدر رکھتی ہے جس طرح مرد اللہ کی عبادت اور بندگی کر سکتا ہے اسی طرح عورت بھی اللہ کی عبادت اور بندگی کر سکتی ہے دین اور اخلاق کے بارے میں دونوں ایک دوسرے سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کے بارے میں تمام علماء کی رائے ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت عائشہؓ کو پیدا نہ کرتا اور حضورؐ کی زوجیت میں نہ آتیں تو امت کو آدھا دین ملتا لیکن عورت ہونے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کو وہ مقام نہیں دیا گیا کہ وہ میدان جنگ میں فوج کی قیادت کریں۔ مجاہد مرد بھی اس وقت تک جہاد نہیں کر سکتا جب تک اس کے گھر کا مجاہد گھر کی تکمیل دیکھ بھال کرنے میں اپنی قوت نہ لگا دے۔ یعنی میدان جنگ کا جہاد گھر کے جہاد کا مہون منت ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ جس طرح چاند اور سورج کے الگ الگ کام ہیں اسی طرح مرد عورت کے جدا جدا کام ہیں اگر ایک دوسرے کے کام میں رکاوٹ بنے گا تو کام صحیح نہیں ہوگا وہ عورت جو خالد بن ولیدؓ، ختمیہؓ، صلاح الدین ایوبیؒ جیسے بہادر پیدا کر سکتی ہے وہ میدان جنگ میں فوج کی قیادت نہیں کر سکتی۔

آج اسلام دشمن تحریکوں نے سائنسی اور سیاسی ترقی کی بدولت مسلمانوں پر ہر طرح کی برتری حاصل کر لی ہے عورتوں کے پردے پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ پردہ عورت کی صحت کو برباد کرنے کے ساتھ اخلاقی قوتوں میں خلل ڈالتا ہے پردہ نشین خواتین کی کمزوری ہے کہ وہ خواہشوں کو روکنے میں قاصر رہتی ہیں اور وہ نفسانی خواہشات کی قید میں گرفتار ہو جاتی ہیں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پردہ عورتوں کو حصول علم میں بڑی رکاوٹ ہے وہ ذہنی قوتوں کی نشوونما کے راستے میں حائل ہے تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مرد اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ نہیں سکتا۔ نتیجہ باہمی ناچاری اور بکثرت طلاق۔

اس مغربی نظریہ کی ہم اس طرح تردید کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ تو کمزور ہیں اور نہ مریض وہ تو بے پردہ عورتوں سے زیادہ صحت مند ہوتی ہیں اگر ایسا ہوتا تو چودہ سو سال پردہ میں رہ کر وہ اپنا وجود ہی بھودیتیں اور ان کی نسل تو نہایت ہی کمزور ہوتی چلی جاتی مگر ہم بایولوجی کے حکم کے خلاف دیکھتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں صحت مند بھی ہوتی ہیں اور ان کی اولاد بھی تندرست و توانا غیر متعوب و بلند حوصلہ، بہادر اور اخلاقی قوتوں سے بھرپور نظر آتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی نہ مریض ہے نہ کمزور اور یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کی عمر بھی دراز ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رومیہ، لودی، پٹھان مغل وغیرہ قومیں اپنی عورتوں کا بسا یہ کبھی ناجحرم کو دکھانا نہیں چاہتے یہ ہی خوبی راجپوت عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بھی پردہ نشین ہوتی ہیں انھیں عورتوں نے بھیم، ارجن اور پرتاپ جیسے غیرت مند اور بہادر جیسے پیدا کیے جب سے ان عورتوں نے پردہ چھوڑا ایک بھی ارجن اور بھیم پیدا نہ کر سکیں۔ لوگوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ پردہ نشین عورتوں کو نہ تو تازہ ہوا ملتی ہے نہ روشنی، صرف اندھیری کو کھڑی میں قیدی کی طرح زندگی گزار دیتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے لوگوں نے پردہ نشین عورتوں کا نہ تو رہن سہن دیکھا ہے نہ ان کے مکانات محلات دیکھے ہی نہیں ان کے مکانات تو بہت وسیع ہوتے ہیں بے پردہ عورتوں کے

مکان صرف ان کے صحن کے برابر ہوتے ہیں پردہ کی بدولت ہی تعمیرات میں جو ترقیاں ہوئیں صرف مسلمانوں کا ہی طفیل ہے ان کے محلات ملک و قوم کی آبرو و عظمت اور فن تعمیر کے بے مثال نمونے ہیں مکانوں میں برآمدے، کھڑکی، روشن دان بادکش جھڑکے یہ سب پردے کی ہی دین ہیں۔

مغرب کے مفکرین اور مورخین نے مسلمان عورت کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح یورپ کے قرون وسطیٰ میں عورت انتہائی پسماندہ اور مرد کے ظلم و ستم اور ہوس کا شکار بنی رہی اسی طرح مسلمان عورت بھی مرد کی قید میں گرفتار رہی اور علم و ادب تہذیب و تمدن میں کوئی خدمت نہ کر سکی جس کا راز صرف پردہ ہے۔ چنانچہ مسلم عورت اس فلسفہ سے متاثر ہوئی کہ یورپ کا فلسفہ صحیح ہے مسلم عورت نے سوچا کہ مرد کے حکم پر قید ہو کر مکان میں بند ہونے سے سیاست کی اسٹیج پر میری آواز بلند نہیں ہو سکتی شعر و ادب میں میرے نغمے نہیں گونجتے مردوں کے دوش بدوش شوسل کاموں میں میرا نام نہیں لیا جاتا تو تاریخ مجھ سے کونسی خدمت کی توقع رکھتی ہے جب تک میرے سر اور منہ پر پردہ رہے گا تب تک خدمت تاریخ اور میرے درمیان ایک پہاڑ حائل رہے گا اس مغربی مفکرین کے جھوٹے پروپیگنڈہ نے مسلم عورت کے دل و دماغ کو متاثر کر دیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت سماجی مذہبی اور ثقافتی خدمت کو انجام دینے میں مرد سے کبھی پیچھے نہیں رہی اور علم و ادب کے فروغ کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اگر ہم اسلام کے دورِ اول اور دوسری صدی ہجری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خواتین کی ایک بڑی تعداد ان علوم میں منہمک تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ جو خاتون اپنی ایسی روشن تاریخ رکھتی ہو وہ خود اپنی ہی تاریخ سے بیگانہ ہے اور غلط پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اپنے تابناک ماضی کو تاریک خیال کر بیٹھی ہے۔ تیسری صدی ہجری سے نویں صدی تک ایک

طویل فہرست اور بڑی تعداد خواتین کی دیکھتے ہیں جو حدیث تفسیر اور فقہ میں مصروف نظر آتی ہیں حضرت عائشہؓ کو حدیث و فقہ میں سرفہرست دیکھتے ہیں ان کے علاوہ بہت سی (اور عائشہؓ نام کی جن کی تعداد ۵۵ تھی) محدثات گزری ہیں۔ اسی طرح زینبؓ نام کی ۶۵ محدثات کا ذکر ملتا ہے۔

عابدۃ المدینہ نام کی ایک خاتون نے دس ہزار احادیث کی روایت کی ہے۔ کثیر تعداد ایسی خواتین کی ہے جو بڑے بڑے ائمہ حدیث کی استاد اور شیخ رہی ہیں۔ ان خواتین کے سامنے جلیل القدر ائمہ حدیث زانوے تلمذ طے کرتے رہے ہیں۔ آسیہ بنت جابر اللہ اور خدیجہ بنت احمد نے ہی امام سیوطی کو روایت کی اجازت دی۔ امام ذہبی مصنف تذکرۃ الحفاظ کا بیان ہے کہ ”میں نے حبیبہ بنت عبد الرحمن مفسرہ سے حدیث کا سمع کیا ہے“

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ ”جب وہ دمشق گیا تو اس وقت جامع بنی امیہ میں مشہور محدث زینب بنت احمد المقدسیہ (۶۲۶-۶۴۰) درس حدیث دیا کرتی تھیں۔ ابن بطوطہ اس کے درس میں شریک ہوا اور اس سے حدیث کا سماع کیا“ عبد الرحیم العراقي نے رقیہ بنت عبد الغفار سے حدیث کا سماع کیا۔ علامہ سخاوی نے اپنی کتاب الفوالامع میں ایسی خواتین کی ایک طویل فہرست دی ہے جن سے موصوف نے حدیث سنی اور پڑھی اور روایت کی اجازت لی، عبد الرحیم خان خاناں کی دختر نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواتین حدیث فقہ تفسیر کے علاوہ دیگر علوم و فنون مثلاً علم طب، نحو، عروض، لغت، تاریخ،

۱۔ اعلام النساء

۲۔ مقری

۳۔ بحوالہ اسلامی نظام میں عورت کا مقام مائل خیر آبادی ص ۱۸۹

حساب، خطاطی، شاعری، علم نجوم، فلسفہ، منطق، رمل، سیمیا وغیرہ وغیرہ میں مرد سے پیچھے نہیں رہیں۔ بہت سی خواتین قرآن حافظ دکھائی دیتی ہیں امراض نسواں امراض چشم، جراحیات، علم تشخیص اور اپریشن میں درک رکھتی تھیں جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب ”اسلام میں عورت کا مقام“ میں تحریر کیا ہے کہ :

”طافہ بنت ابوالفرج تاریخ اسلام پر گہری نگاہ رکھتی تھیں اور

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عالمانہ لیکچر دیا کرتی تھیں۔“

عائشہ بنت عثمان بن محمد، قاہرہ میں رہتی تھیں۔ بہت بڑی عالمہ تھیں قوت حافظہ بہت تیز تھا، شعر و شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ عائشہ الباغونیہ دمشق علوم دینی کے علاوہ شعر و ادب سے بے حد ذوق رکھتی تھیں تصوف میں ڈوبی رہتی تھیں۔ مقررہ کی زوجہ سول رمل مکالمے میں ماہر تھیں۔ مریم بنت نصر اللہ نحاس نے حروف متہجی کی ترتیب پر ”معروض لسا“ کتاب لکھی۔ حافظ ابن حجر کے مشائخ میں زینب بنت عثمان دمشقیہ، زینب بنت محمد بن عثمان الامشقیہ اور زینب بنت محمد الامشقیہ بھی ہیں۔ عائشہ بنت عبدالہادی جوہریہ بنت احمد الہکاری اور زہرہ بنت عمر حبشہ بنت ابوالوفار بھی اسی صف میں آتی ہیں۔ محدثہ حمو بنت احمد الحمید اپنے زمانہ کی مشہور عالمہ تھیں۔ آسیہ بنت جابر اللہ، آسیہ بنت احمد، آمنہ بنت محمد رشیدی، آمنہ بنت موسیٰ، اسماء بنت عبداللہ، خدیجہ بنت فرج وغیرہ اپنے زمانہ کی معروف ائمہ تھیں۔ اُمت۔ الولاء زینب بنت الحسین، زلیخا بنت اسمعیل فاطمہ بنت احمد یحییٰ فقہ کی مشہور عالمہ تھیں۔ مکنا س کی خاتون رحمت بنت الجنان تغیر قرآن میں امامت کا درجہ رکھتی تھیں۔ امتہ انوار حسین، نحو اور حساب میں اعلیٰ پیمانے کی درس گاہ رکھتی تھیں۔ امتہ الخالق بنت عبدالطیف کو اعلام النساء اعلیٰ درجہ کی مصنفہ مانا ہے۔ اس کے قوت حافظہ کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ دھما بنت یحییٰ، الروضیہ اندلس بھی اپنے زمانہ کی معروف عالمہ تھیں۔ بنت الکبیر نامی ایک لڑکی نحو و لغت کی امام تھیں فاطمہ الزہریہ مصری عروض

ونحو کی ماہر تھی عائشہ تیمور مصری انھیں کی شاگردہ تھی۔ امام سیوطی نے طبقات النحویین میں لبنی کا تبہ کی عالمہ ہونے کے بارے میں لکھا کہ وہ اپنے زمانے کی بے مثال تھی اسما قسطنطنیہ کی معروف خطاطہ تھی۔

— حلیمہ بنت صادق ترکی کی مشہور خطاطہ تھی۔ بادشاہ نامی خاتون خط یا قوتی میں قرآن لکھا کرتی تھی۔ غناطہ کی سیدہ بنت عبدالغنی قرآن حافظ تھی اور فن کتابت کی ماہر تھی اس نے امام غزالی کی کتاب ”احیاء العلوم“ اور دیگر معروف کتابوں کی کئی بار کتابت کی جو پیسہ اس کو انعام میں ملتا تھا وہ قیدیوں اور مجبور و لاچاروں پر خرچ کر دیتی تھی۔ صارة الحلیدہ شامی بڑی ادیبہ اور طبیبہ تھی، خطاطی میں بھی ماہر تھی۔ سونے کو کیمیائی طریقے سے محلول کر کے قرآن لکھتی تھی۔ فاطمہ بنت حسن اقرع بھی معروف خطاطہ تھی۔ یاسمین جو پہلے گلبرگہ اور پھر دہلی میں آکر بس گئی، مشہور کاتبہ تھی اور مشہور شاعرہ بھی تھی۔ اخت الحفید ابو بکر فن طب میں ماہر تھی، امراض چشم کی ماہر تھی آپریشن کرنے میں ابو عبداللہ الکفانی درک رکھتی تھی، خطاطی میں ماہر تھی، جنگی ہتھیاروں کے استعمال کرنے کی حیرت انگیز مشق رکھتی تھی، ناج الاول۔ جو فلسفہ اور منطق میں ماہر تھی عائشہ بنت عبداللہ حدیث اور تاریخ میں گہری نظر رکھتی تھی، اپنے دادا ابن طبری پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی۔

اسلام میں اخلاقی تعلیم میں سب سے زیادہ اہم تعلیم خدمتِ خلق (معاشرہ) ہے لاچار مجبور مفلس و نادار مساکین مصیبت زدگان کی امداد و فاد عام کے لیے ادارے قائم کرنا شفا خانے کھولنا وغیرہ میں بھی مسلم خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ الف بنت محدث علم الدین کے پاس طلبہ گرد و نواح سے درس لینے آتے تھے۔ خاتون، ان کے مصارف خوراک لباس رہائش کا بھی انتظام کرتی تھی۔ بیواؤں کی تلاش میں رہتی تھی ان کے آرام کی کوشش کرتی تھی۔ ابن بطوطہ ایک شامی خاتون بنت ام لفظی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ”جب ہم اس خاتون کے پاس گئے وہ صحن میں بیٹھی قرآن کریم

پڑھ رہی تھی ان کے ایک طرف دس بوڑھی عورتیں درس سن رہی تھیں اور دوسری طرف بیس نوخیز لڑکیاں کشیدہ کاری کا کام کر رہی تھیں۔ ”یہ یہی خاتون خانہ داری کی تعلیم بھی دیتی تھی ادیب التحریری کی بیٹی نے اپنی تمام آمدنی فقراء و مساکین اور قرآن پاک کی تعلیم دینے کے لیے وقف کر دی تھی۔ زینب بن محمد پاشا ترکی نے چار سو غریب خانوں کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی افریقہ کے امیر مغربن پادیس کی حرم زینخانہ شہروں اور بستیوں میں ۶۰ ہزار کفن تقسیم کرائے حج کے موقع پر حاجیوں کے لیے برف اور کھانڈ کے شتوقسیم کرائے بے سہارا حاجیوں کے لیے پانچ سو سواریوں کا انتظام کیا خانہ کعبہ پر دس ہزار دینار نچہ اور کیے تھیں سو غلام اور لونڈیاں آزاد کیں فقراء اور مجاہدوں کی جھولیاں بھر دیں متوکل علی اللہ کی والدہ شجاع بہت ہی سخی طبیعت خاتون تھیں لوگوں کی پوشیدہ طور سے مدد کرتی تھیں حج کے راستے میں سخاوت کی بارش کرتی چلی گئیں۔ طغائی ام نوک نے جہیز دے کر تمام غلام لونڈیوں کو آزاد کر دیا اور ۸۰ غلام آزاد کیے حاجیوں کے لیے مکہ میں لگنے والی جنگی معاف کر دی۔ اسماء بنت موسیٰ جو مین کی رہنے والی تھی۔ بغیر معاوضہ لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دیتی تھی۔ فاطمہ الحاضنہ نے ایک بڑا کتب خانہ مسجد عقد کو وقف کر دیا۔

یہ مثالیں تفہیم القرآن مولانا ابوالکلام آزاد کی ”مسلمان عورت“ اور مولانا شبلی کی کتاب جسٹس امیر علی کی کتاب ”اسلام میں عورت کا مقام“ اور مانل خیر آبادی کی کتاب ”اسلامی نظام میں عورت کا مقام“ تاریخی تحقیق کے بعد تحریر کی ہیں۔ مقدمہ لکھتے وقت سائنٹفک اور فطری اصول اور تاریخی شہادتیں گواہی کے لیے پیش گئی ہیں۔

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کی ایسی حفاظت کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ اس کی قانونی ہستی قائم ہوئی۔ جو آج بیسویں صدی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد عیسائی عورت کو حاصل نہیں ہے۔“

۱۷ مسٹر پیٹر کر بیٹس

۱۷ عجائب الاسفار

یورپ کے علماء نے بایولوجی، سائیکولوجی تحقیقات اور تجارتی تجربات سے ثابت کیا ہے کہ عورت علمی اور عملی طور پر مرد کے برابر ہے مگر یہ پروپیگنڈہ سراسر غلط ہے علم تشریح الابدان کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جسم کے اعتبار سے مرد عورت سے قوی ہوتا ہے اس کے علاوہ عورت کے وزن، قد، رگ، پٹھے، دل، دماغ، بھیجا سانس کی حرکت، خواص خمسہ، پیچ پرزے یعنی ہر لحاظ سے عورت اور مرد کی ہر چیز میں فرق ہے یہی فرق جانوروں کے تراور مادہ میں ہے — چڑیوں کیڑے مکوڑے، ہاتھی اونٹ، مرغ، کبوتر، سارس، مور، چوٹی وغیرہ میں بھی یہی فرق ملے گا۔ نر مادہ کا فرق بقول ایگر بیگلچر کے ماہرین حیوانات (پیرا پودوں) میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں علمی تجربے سے صحیح ثابت ہو چکی ہیں مرد کے قد سے عورت کا قد بارہ سینٹی میٹر کم ہے مرد کا وزن عورت کے وزن سے پانچ کلو زیادہ ہوتا ہے (انسانی کلو پیڈیا) قوت کے لحاظ سے عورت آدھی ہے عورت کے رگ پٹھے مرد سے کم تیز اور متحرک ہوتے ہیں۔ دل کا حجم، دل کی دھڑکن، دل کا اثر دل کے خون کا اچھال، دل کا رگوں کی طرف خون پھینکا وغیرہ میں بہت فرق ہے۔ مرد کا دل ۶۰ ڈرام عورت سے زیادہ وزن رکھتا ہے، عورت کا دل کمزور اور ضعیف ہوتا ہے مرد میں اصل اور فطری حرارت عورت سے دوگنی ہوتی ہے۔

فلاسفر پروڈن نے لکھا ہے کہ ”دماغ اور دل کمزور ہونے سے اور وجدان اور عقل کے ضعف کی وجہ سے عورت جس بات اور جس چیز کی اچھائی بُرائی کے بارے میں قائم کرتی ہے وہ مرد کی رائے کے مطابق نہیں، وہ آگے تحریر کرتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے بھی عورت مرد سے کم تر ہوتی ہے،“

حواص خمسہ یعنی سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور دیکھنے کے بارے میں نکولس

اور علامہ شبلی نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ پانچوں طاقتیں مرد کی عورت سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ مرد کی سونگھنے کی طاقت تو پانچ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ علامہ لومبروز اور سنیر جی کی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے۔

(۱) اگر مرد عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے تو مرد کی چھونے کی طاقت عورت کی چھونے کی طاقت پر غالب آجائے گی۔

(۲) عورت میں احساس کی کمی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شکم میں بچہ کا بوجھ لادے پھرتی ہے۔ یہ قدرت کا احسان ہے اگر احساس قوی ہوتا تو کبھی بھی اس کو برداشت نہیں کرتی رسم سستی کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ”یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے عورت کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کا انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی“

مرد کا بھیجا بھی عورت سے سو ڈرام بڑا ہوتا ہے۔ عورت مرد سے جلد نہ کوئی فیصلہ لے سکتی ہے نہ حوصلہ دکھا سکتی ہے۔ اس کی جلد سوچنے کی رفتار دھیمی ہوتی ہے وہ کسی بات کو سمجھنے میں دیر کرتی ہے پیچ پڑنے بھی عورت کے بھیجے میں مرد سے کم ہوتے ہیں۔ عورت کی کمیوں پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ عورت کو ایک مدت سے دبا کر پست اور گرا کر رکھا ہے۔ وہ ہزاروں برس سے مرد کے تسلط، جبر، بے رحمی اور غلامی کا نشانہ رہی اور آزادانہ پد و رشت سے محروم رہی ورنہ یہ کمیاں عورت میں نہیں آتیں اگر اس طرح مرد کو رکھا جاتا تو مرد میں بھی یہ کمیاں ضرور پیدا ہو جاتیں۔ اس کے جواب میں پروفیسر ووفارینی کی دلیلیں ملاحظہ ہوں :

(۱) وحشی قومیں جو ہزاروں سال سے آزادانہ زندگی بسر کر رہی ہیں ان کی عورتوں

اور مردوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے ان میں نہ تعلیم نہ تربیت نہ تمدن افریقہ کی وحشی قوموں کی مثال دیکھ لیجیے کیا بونوں نے کبھی اپنی عورتوں کو غلام بنایا تھا یہ تو صرف قدرت کا فیصلہ ہے۔

(۲) اگر عورت کو باہری کاموں سے روکنے پر یہ کہیاں دکھائی دیتی ہیں تو خط استوا کے خطے میں رہنے والی عورتوں اور مردوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے جب کہ وہاں کی عورتیں مرد کے تسلط سے آزاد ہیں اور باہر کے کاموں میں کھیتی باڑی بھی کرتی ہیں جس طرح امریکہ کے مرد عورتوں میں فرق پایا جاتا ہے وہی فرق افریقہ یعنی دنیا کے ہر خطے میں ملتا ہے۔

جوابات پیش کی جا رہی ہیں یہ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جو صرف یورپ کے علماء کو ہی ملہم سمجھ کر ان کی ہر بات کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں یہ انسائیکلو پیڈیا سے مستند ہیں اور انسائیکلو پیڈیا آج کے علم و فن کا عطر جو ہر اور اس صدی کی راہیوں کا خلاصہ ہے۔

مائل خیر آبادی اپنی معروف تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ ”عورتوں میں تمام کمزوریوں کے ساتھ مرد سے زیادہ جو قوت ہے وہ انفعال اور بیجان کی قوت ہے اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی کیوں کہ انفعال کی زیادتی (یعنی دوسروں سے متاثر ہو جانا) اور بیجان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت عقل جلدی کھو بیٹھتی ہے اور ناکام ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ورفارینی لکھتا ہے کہ مرد میں سوچنے اور ادراک کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور عورت میں انفعال اور بیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہوتا ہے یہ سب

۱۔ اسلامی نظام میں عورت کا مقام ص ۲۶

فطری کمزوریوں کی وجہ سے عورت فوجی کام نہیں کر سکتی، نہ قدرت نے اسے اس کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہاں وہ فوجی سپہ سالار تو پیدا کر سکتی ہے اگر یہ کام بھی عورت پر ڈال دیں تو قومی غیرت کا زوال ہو جائے گا۔ نوجوانوں میں حفاظت کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ قوم میں لڑنے مرنے کی امنگ مرجائے گی وطن کی عزت و آبرو اور مرد کی زندگی کی قدر و قیمت ہی مٹ جائے گی۔ کمانڈران چیف کری اپانے امرتسر کی تقریر میں عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”دیویو تم گھر کے کام کاج سنبھالو، فوج کے کاموں میں تمہاری ضرورت نہیں ہمارے پاس مردوں کی کمی نہیں“ پھر ۱۹۵۰ء میں گورنر جنرل نے آرمنڈ فورسنر آرڈیننس کے نام سے ایک ہنگامی قانون لاگو کیا کہ :

”اس قانون کے ذریعے فوج میں عورتوں کی ملازمت اور فوجیوں کی ٹریڈ یونینوں میں عورت کی شرکت پر پابندیاں عاید کی گئیں۔۔۔۔۔ کسی عورت کو فوج میں نہیں بیا جائے گا۔ ہاں اگر مرکزی حکومت سرکاری گزٹ کے ذریعے کسی برانچ یا کور کے لیے بطور خاص اجازت دیدے“ لے

عورتوں کے برابری کے دعویٰ دار بھی مان گئے کہ چھوٹے چھوٹے کام جیسے ٹائپنگ، نرسنگ، ٹیلیفون ایکسچینج وغیرہ کو مرد ہی بحسن اسلوب کر سکتا ہے۔ ان کاموں میں بھی عورتیں ۵۰ فی صد نا کام ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ہفتہ دس دن اور دو تین سال بعد دو تین ماہ ایسے ہوتے ہیں جب وہ دوسروں کی محتاج ہوتی ہے۔ عورت مرد کے کمزور جہاں ہے۔ اگر وہ مرد کے کام کرے گی تو ضرور انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اگر عورت اصل کام چھوڑ کر کمانے کے شوق میں باہر نکلتی ہے یا سیاست میں حصہ لیتی ہے تو اسے روحانی اور مادی دونوں نقصان کھگتے پڑیں گے۔ مرد کے شانہ بشانہ

لے سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء، بحوالہ مانل خیر آبادی، اسلامی نظام میں عورت

کا مقام ص ۹۷-۹۸۔

کام کرنے کی ضد میں اگر وہ حیض بند کراتی ہے تو وہ مختلف امراض میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ کوڑ کے مرض میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کی عورتیں اولاد سے بھی محروم رہتی ہیں۔ اگر عورت اپنے ڈھیلے لباس کو چھوڑ کر چست لباس پہنتی ہے جو ڈاکٹری لحاظ سے مضر ہے کیوں کہ اس سے دوران خون رکتا ہے اور اس کے جسم کے درمیانی غدودوں کو بند کرنے والا ہوتا ہے۔ گھر بچوں کو چھوڑ کر باہر جانے والی عورت بچوں کے لیے ایک خوفناک وحشی کی حیثیت رکھتی ہے وہ ڈبل کمائی کو کم عقل گھر کی خوشحالی سمجھ کر گمراہ ہو گئی ہے حقیقت میں اس نے خود گھر کی برکت اور رونق ختم کر دی ہے۔ اولاد ماں کی حقیقی محبت، پیار کو ترس رہی ہے۔ گھر میں چاروں طرف بد حالی اور بد نظمی نظر آتی ہے۔ زیادہ تر پیسہ نوکروں اور ڈاکٹروں کو چلا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے حقوق کے لیے اسٹرائک کرتی ہے تخریب کاری تحریکوں میں حصہ لیتی ہے توڑ پھوڑ کرنے والے ہنگاموں میں شریک ہوتی ہے تو خود سوچیے جس کے پیٹ میں ایک جان پل رہی ہے اس پر کیا اثر ہوگا نتیجہ بچہ کے دل و دماغ میں تخریب، توڑ پھوڑ قتل و غارت گری۔

”قدرت نے عورت کو محبوبیت بخشی ہے اسے ممتا کا جمال دیا ہے مگر محبوبیت کے بدلے وہ دشمن بن گئی ہے۔ قدرت نے عورت کو دلنشینی کا تسم عنایت فرمایا مگر اس کے بدلے اس کے چہرے پر لیڈرانہ تیور نظر آنے لگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں مرد کو جو دیا ہے (متاع) سب سے بہتر چیز عورت ہے لیکن آج عورت کمانے کی دھن میں اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کر رہی ہے جو خوبیاں ایک دشمن کی ہیں گویا وہ بدترین متاع بن رہی ہے۔“

عورت کو باہر دیکھ کر ذوق نظر کے طور پر مرد اسے برداشت کرتا ہے مگر وہ نہ تو عورت کی قابلیت نہ اس کے کسی بھی کام سے متاثر ہوتا ہے سیاسی میدان میں بھی وہ اس کے

حسن سے اپنی آنکھیں سینکتا ہے۔ عورت سیاست میں بھی مرد سے آگے نہ بڑھ سکی مغرب میں بھی عورت کے سامنے یہ ہی نتیجہ آیا۔

خاندان وہ سرچشمہ ہے جہاں اجتماعی اور سیاسی کارکن ڈھالے جاتے ہیں خاندان کے نام کا نام ہی سماج۔ یعنی معاشرہ ہے پھر سماج سے ریاست وجود میں آتی ہے ریاست کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں گھر کی حالت سدھارنا لازمی ہے مغرب میں عورت سے گھر کا کام نہیں لیا جا رہا جس کا اثر ہمارے مشرق کے گھروں پر بھی پڑا اب مردوں کے لیے گھر کلب اور ہوٹل بن گئے ہیں۔ عورت اگر گھر میں ہے تو گھر چین ہے باہر ہے تو گھر دھول بچے باہر سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں بچوں میں مختلف بیماریاں اور عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نوکر اور نوکرانیاں گھر کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ عورت کی پاکیزگی اور پتی ورتا سے خاندانی شرافت غائب ہوتی دکھائی دیتی ہے عورت کی ممتا کا جو جمال ہمارے گھروں کو گھنی چھاؤں دیتا ہے وہ مغربی دنیا کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

عورت ہی بچوں کو خیر و وقار کا درس دیتی ہے ایسا بچہ ہی مادر وطن پر جان دیتا ہے۔ وطن کا سپوت بنتا ہے۔ ماں کی عزت پر جان دیتا ہے اس کی آبرو برقرار رکھتا ہے مغرب کی دنیا بھی کوئی دنیا ہے جہاں بچہ اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتا۔ ایسی اولاد سماج اور ریاست کو کیا سنبھال سکتی ہے گھر کے انتشار ہی سے سماج اور ریاست میں نت نئی خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔

امریکہ میں عورت وزیراعظم بنی تو اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ تجربہ یہودیوں نے بھی فلسطین میں کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہاں بھی عورت کی درگتی ہوئی۔ لنکا، پاکستان اور ہندوستان

کی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں ”جس قوم کی سربراہ عورت ہوگی وہ قوم برباد ہو جائے گی“ مرآۃ حجتی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ ”جو عورتیں مردوں کے معاملات میں دخل انداز ہونے کی غیر ضروری کوششیں کرتی ہیں وہ قدرت کی دی ہوئی اس نعمت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جس سے قدرت نے انھیں مردوں سے زیادہ حسین اور دل آویز بنا یا ہے۔“

پوپ پال بھی عورتوں کی قیادت کو چرچ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ عورتوں کی قیادت کو خدا کے اصولوں کے خلاف بتاتا ہے۔“

اگر آج ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل مرد، عورت کا غلام ہی نہیں بلکہ غلام سے بھی بڑھ کر غلام ہے اگر ہم مرد کی روحانی اور جسمانی محنتوں اور تکلیفوں کو جو مرد عورت کے لیے اٹھاتا ہے اور اپنی جان جو حکم میں ڈالتا ہے صرف عورت کے لیے عورت کے طرفداروں کی دلیلیں قدرت کے اصولوں کے خلاف ہیں اور ان کے عقلی گدے ہیں اور عقلی گدے کبھی اصول اور قانون نہیں بن سکتے۔ یہ تو بیان کیا جا چکا ہے کہ عورت اور مرد کا آپسی تعاون ایک دوسرے کو کامل بناتا ہے جس سے سماج کی عمارت قائم ہوتی ہے مگر کاموں میں حدود کو توڑنا سماج کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے اسی وجہ سے عورت سے دونوں ہی ہتھیار پردہ اور اخلاق چھین لیے ہیں اسی لیے عورت عورت نہیں رہی اب دنیا کے لوگ عورت کے لطف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جس کے پلکوں کے پردے میں جیا کے موتی جھلکتے تھے۔ اب وہ زمانہ قریب ہے کہ متمدن ملک شریف عورت سے محروم ہو جائیں گے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے سکون کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت سماج کے لیے قابل احترام ہیں انسان انسان برابر ہیں کام الگ الگ ہیں جیسے ایک ملازمت کرتا ہے تو دوسرا تجارت اور

تیسرا دونوں کے لیے کھانا بناتا ہے۔

عورتوں کے حاکم بنانے سے ملک میں سازشوں کے جال بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مردوں کا قلبی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ فرانس کا انقلاب روم اور اندرا کا زوال سچے ثبوت ہیں۔ پردہ سے عورت کا باہر آنا معلوم ہوتا ہے کہ پہلو سے دل نکل گیا جب رومیوں کے اعصاب پر عورت سوار ہوئی تب ہی سے حکومت کے شاندار محل اور مضبوط عمارت کی ایک ایک اینٹ بجھ گئی۔

جب وہ پردے میں تھی تو روم ترقی کرتا چلا گیا۔ دنیا کی تاریخ بھی خوب ہے پلٹ پلٹ کر حالات دہراتی رہتی ہے فلاسفر کائن نے پردہ کی بہت حمایت کی علامہ لوس نے پردہ کی بہت مخالفت کی مگر کائن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی وہاں مرد اور عورتوں میں رقابت شروع ہوتی رہی اُدھر شیطان اپنا کام کرتا رہا سلطنت کو مردوں نے عورت کے ذریعہ برباد کرایا۔ آج دنیا کا جو نقشہ بنتا جا رہا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے مرد بری طرح سے عورت سے بدلہ لے رہا ہے اس کو جادوگر شیطان کا ایجنٹ کانٹوں کی جھاڑی سانپ کی اولاد بتاتے ہوئے ہر طرح سے عیش و نشاط کا سامان مانتا ہے۔

اسلام نے عورت کو اپنے حکیمانہ قوانین کے مضبوط قلعہ میں پناہ دی ہے اسی کی برکت ہے کہ مسلمان خاتون چودہ سو سال ان سارے انقلابوں سے بچی رہی جو اسلام سے باہر کی دنیا میں ہوتے رہے اور عورت اس کا نشانہ بنتی رہی پردہ ایک ایسی نعمت ہے کہ عورت کو مرد کے ہاتھوں کا کھلونہ بننے سے روکتا ہے انسائیکلو پیڈیا کا مصنف عورتوں کے فتنے میں پڑنے کی وجہ سے بڑے دردناک الفاظ میں تکرر کرتا ہے۔

”ہماری موجودہ سوسائٹی میں جس میں عورتوں کو حد سے زیادہ آزادی ملی ہے وہاں نظر آرہا ہے کہ عورت کے مذاق کی کمینگی اور اس کی وہ شدید خواہش جو اسے ہمیشہ بناؤ سنگار

اور حسن کو ترقی دینے کی فکر میں مصروف رکھتی ہے آخر کار اس حالت سے بھی کئی درجہ بڑھ کر آفت ڈھانے والی اور بھیانک ثابت ہوگی جو ہم سے پہلے روماء والوں پر گذر چکی ہے۔ ایک ایشیائی آدمی اس جملہ کو سن کر۔ چونک پڑے گا کیوں کہ یہ اس کے وہم و گمان میں ہے ہی نہیں اسے ایک مدت سے یورپ کی تہذیب سے حسن ظن پیدا ہو گیا ہے وہ مغرب کا غلام ہے۔“

دُخترانِ ہند میں مولانا محمد علم الدین تحریر کرتے ہیں کہ ”تہذیب جدید نے آج ہندوستانی عورتوں کی ذہنیت کو بالکل بدل دیا ہے پہلے تو ہانکے سورما پیدا کرتی اور ان کی تربیت کو اہم فریضہ سمجھتی تھیں۔ ان کے آغوشِ تربیت نے بنی نوع انسان کے حقیقی خیر خواہ اچھے شہری مذہب کے پرستار بنائے۔ گھر کی ملکہ، چراغ خانہ نہیں مگر آج شمع محفل،۔۔۔ کی پری بننے میں فخر کر رہی ہے۔ وہ سب بھول گئی جو اس کو مذہب و ملت اور تمدن نے اس کے ذمہ عائد کیے۔ فرشتہ خصال بیٹیوں نے روحانی، تمدن اور معاشرتی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیے۔۔۔۔ کتاب میں اس یورپ کے نظریہ کی بھرپور تردید کی گئی ہے جو یورپ کی عامیانہ تقلید نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اور ہم نے رسم پردہ کو خیر آباد کر دیا ہے“

یہ کتاب ان مغل شہزادیوں کی سرگذشت ہے جو باوجود پردہ علم و فن اخلاق تہذیب و تمدن مذہب اور سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں جو آج کی بے پردہ عورت میں نہیں ملتا۔ یہ کتاب ان شریف شہزادیوں کی تاریخ ہے جن کے پردہ میں تمدن اور معاشرتی زندگی کے بہت سے پہلو پنہاں ہیں انھوں نے مسلم تہذیب اور شریفانہ کلچر اور تمدن کی نگہبانی کی ان کی لطیف زبان اور کاموں سے مغل تہذیب پر روشنی پڑتی ہے کتاب کا اصلی مقصد ہے کہ آج کی خواتین ان کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

قدم اور وسطی دور کے ہندوستانی سماج میں عورتوں کی حالت کم تر تھی مردوں کی خدمت کرنا ہی عورت کا مقصد حیات تھا۔ بیٹی کی حیثیت سے باپ کی سرپرستی میں رہتی تھی۔ بیوی کی حیثیت سے شوہر کی نگرانی اور شوہر کی موت کے بعد اگر وہ زندہ رہتی تو بڑا بیٹا اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس طرح عورت کی پوری زندگی کسی نہ کسی کی نگرانی میں گزرتی تھی اور سماج کے ضوابط اور طور طریق نے اس پر کم مائیگی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ بقول ڈاکٹر کنور محمد اشرف کہ ”پیدائش کے وقت اسے ناخواندہ مہمان تصور کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ بدنصیب بیٹی باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتی اسی وجہ سے اسے بچپن میں ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہ گئی تو اسے شوہر کے سپرد کر دیا جاتا اگر اس کی موت دورانِ حمل میں ہو جاتی تو وہ بہت خوفناک بدروح کی شکل اختیار کر لیتی جسے چڑیل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا اختتام موت یا سستی کی حالت میں ممکن تھا۔ یعنی پیدائش سے موت تک عورت کی زندگی ناخوشگوار اور تاریک تھی نہ اس کا مقام قوت و اقتدار میں تھا نہ مذہبی میدان میں پدماوت اور مطلع الانوار وغیرہ سے اس زمانہ کی عورت کی تاریک زندگی کے بہت سے واقعات کا علم ہوتا ہے۔

ٹوڈ کا بیان ہے کہ ”راجپوتنی عورت کی زندگی دوسرے مالک کی خواتین کی نظروں میں خوف زدہ کر دینے کی حد تک سخت تھی زندگی کی ہر منزل پر موت اس کی منتظر رہتی تھی زندگی کے ابتدائی دور میں انیوں سے جوانی میں آگ کے شعلوں سے اور درمیانی عمر میں جنگ کی غیر یقینی حالت میں گزرتی تھی، اس کی زندگی ایک سال کے لیے بھی قابلِ وثوق نہیں تھی۔“

ٹوڈ اپنی تصنیف جلد اول کے صفحہ نمبر ۵۴۰ پر کرشنا کنواری کا حادثہ شہزادی صنفِ نازک کی حیثیت کو بیان کرتا ہے کہ :

۱۔ ٹوڈ جلد دوم ص ۴۴

”ہم پیدائش کے بعد ہی سے قربانی کا نشانہ بنتی ہیں۔ ہم دنیا میں قدم رکھنے بھی نہیں پاتیں کہ ہمیں پھروہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے مجھے اپنے والد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے اتنے عرصہ تک زندہ رہنے کا موقع دیا۔“

ابن بطوطہ ترکوں کی عورتوں کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ :
 ”شیراز کی خواتین ہفتہ میں تین بار واعظ کی تقریر سننے کے لیے مسجد میں جمع ہوتی تھیں۔“

بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے اس سے بڑا اجتماع اس سے پیشتر نہیں دیکھا۔ وہ آگے تحریر کرتا ہے کہ

”ہرات کی خواتین پردے کی پابند تھیں لیکن انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔“ (الرحلہ ج اول ص ۲۰۰-۲۰۱ ج دوم ص ۲۲۸)
 ڈاکٹر کنور محمد انصاف شہوت پرستی کی ایک خاص مثال تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”ایک بار شیرشاہ سوری کے سپاہیوں نے ایک انتہائی حسین لڑکی کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا اسے دیکھ کر شیرشاہ غصے میں چلا آیا۔ اس مجسم معصیت کو یہاں سے لے جاؤ۔ اسے دشمن کے کیمپ میں جانے کا حکم دیا۔ شیرشاہ نے سپاہیوں کو سمجھایا کہ اگر اس حسین دوشیزہ کو اپنے پاس رکھ لینا تو عیاشی کے علاوہ کچھ بھی کر سکتا اور اس طرح سیاسی اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔“

خواجہ امیر خسرو ایک ایماندار پاکدامن لڑکی کو مشورہ دیتے ہیں کہ :
 ”وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کی پیار بھری باتوں میں آنے کے بجائے اپنی جان دیدے۔ (مطلع الانوار، ص ۱۹۸)

باربوسہ نے اپنی تصنیف ”دکن کی خواتین“ اور جاتسی کی تصنیف سے بھی عورتوں کی

جانبازی کا علم ہوتا ہے تاریخ داؤدی اور منتخب التواریخ سے بھی ہمیں اس دور کی
کے بارے میں مکمل جان کاری ہوتی ہے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے جو غیر معمولی قابلیت
بھی رکھتی تھیں۔ ہندو مذہب کے عقائد کے مطابق عورت کا بیٹے کو جنم دینا ماں کے لیے
باعث وقار اور عزت تھا، عورت کی زندگی مختلف دور کی تحریکوں سے متاثر ہوتی
رہی ہے۔ عورت کی زندگی میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔

عورتوں کے بارے میں مسلمانوں کی روایات ہر ملک میں جداگانہ تھیں ترک اپنی
عورتوں کو اچھی خاصی آزادی دیتے تھے۔ ایرانی عورت ہندوستانی عورت سے نسبتاً بہتر
تھی۔ مغلیہ دور میں عورتوں کو زیادہ آزادی نے ان میں عزت اور خودداری کا ایک
احساس پیدا کر دیا۔ مشہور مغل شہنشاہوں کی مائیں اپنے میدانوں میں اتنی ہی فنکارانہ
صلاحیتوں کی حامل تھیں جتنے ان کے بیٹے اپنے میدانوں میں تھے۔ حمیدہ بانو بیگم،
نورجہاں اور ممتاز محل کی مثالیں تعارف کی محتاج نہیں۔ کم درجہ کی خواتین کے
بارے میں مورخین خاموش ہیں اتنا ضرور ہے کہ ان کی زندگی بھی اعلیٰ طبقہ کے مشابہ تھی
بعض اشتائیں بھی بہت سلیقہ شعار اور بہر مند تھیں۔

یہاں رسم پردہ کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ پردہ جس کے معنی حجاب
یا کسی چیز کو چھپانا ہے عام طور پر یہ لفظ نقاب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عورت
کے لیے یہ اصطلاح اس کے کسی جداگانہ عمارت یا عمارت کے کسی جداگانہ حصہ میں
رہنے پر دلالت کرتی ہے۔ عورت کے رہنے کے مقام کو حرم کہا جاتا ہے۔ حرم سے
مراد قیام کی جگہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جملہ خواتین، عوام کی نظروں سے دور رکھی جائے
ایک لڑکی جیسے ہی بالغ ہونے کی عمر پہنچتی ہے یا اس سے پہلے ہی سے الگ تھلگ
رہنا شروع کر دیتی ہے اور اس کی پابندی ہے باہر نکلنے کے بجائے حرم کی چار دیواری
میں ہی رہنا زیادہ آرام دہ ہوتا ہے حرم میں اس کی خدمت کو غلام خواتین خواجہ سرا لے اور
دیگر جملہ ملازمین مامور رکھتے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پردہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا، مگر کچھ کا خیال ہے کہ پردہ تو ہندوستان میں قدیم — زمانے سے ہی گھو گھٹ کی شکل میں جاری تھا۔ اور عورت سماج میں الگ رہتی تھی اتنا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پردہ میں گہرائی اور روایتی پن آگیا جس کے کئی اسباب تھے۔

۱۔ مسلمان اپنے ساتھ طبقہ داری اور نسلی تقسیم و امیرانہ و شاہانہ طرز کے خیالات لے کر ہندوستان آئے غالباً یہ خیالات و نظریات تو کم و بیش یہاں بھی دکھائی دیتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان کے سماج میں جلد ہی مقبول ہو گئے۔

۲۔ عورتوں کا مردوں سے الگ تھلک رہنا تو یہاں بھی موجود تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے یہ بات اور بھی مضبوط ہو گئی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حملہ آوروں خصوصاً منگولوں کے خوف کی وجہ سے عوام پر یہ احساس بھی طاری تھا کہ وہ غیر محفوظ ہیں۔ یہ خوف تقریباً ۲۰۰ سال سے زیادہ طاری رہا۔

مسلم دور میں عام عورتیں صرف نامحرم سے اپنے چہرہ کو ساڑی کے پلو سے ڈھک لیتی تھیں زیادہ تر ایک ہی شادی کا رواج تھا مرد کا کوئی رقیب بھی نہیں ہوتا تھا اس دور میں عورت بھی مضبوط اخلاق کی حامل تھیں اعلیٰ طبقہ کی عورتیں اس حد تک پردہ کرتی تھیں جس حد تک ان کے ذرائع اجازت دیتے تھے کیوں کہ وہ گھریلو کاموں سے آزاد تھیں اعلیٰ طبقہ میں پردہ شرافت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے جس کا جتنا بڑا درجہ ہوتا ہے۔ اس کے گھر کی گھڑیاں اتنی ہی چھوٹی اور بلندی پر ہوتی ہیں اور ان کی خواتین اتنی ہی الگ تھلک رہتی ہیں۔

فیروز شاہ تغلق پہلا سلطان تھا جس نے خواتین کو دہلی سے باہر مقبروں پر جانے سے منع کیا اندروں شہر کے لیے خاص تفصیلات نہیں ملتی مگر عبدالقادر بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے بے پردہ عورتوں کے خلاف سخت قانون بنادیا تھا۔

”ایک شریف عورت چند مرد ملازمین کے ساتھ بند پالکی (ڈولی) میں سفر کرتی تھی ایک غریب یا امیر کی عورت برقع کا استعمال کرتی تھی۔ سلاطین و امراء اپنی خواتین کے لیے پوری ڈھکی ہوئی مقفل پالکیاں استعمال کرتے تھے ہندو امراء نے بھی اس رواج کو اپنالیا تا تا ر خاں کی کنیزیں بند اور مقفل پالکیوں میں سفر کرتی تھیں۔“

تیمور بھی اپنے حرم کو بند پالکیوں میں لے جاتا تھا۔ محمد بن تغلق جب حرم میں داخل ہوتا تو اس کی بڑی احتیاط کرتا تھا کہ اس کی نظر کسی نامحرم پر نہ پڑے۔“
صوفی ہمدانی ان مقامات سے بڑے ڈرتے تھے۔ جہاں مردوں کو عورتوں سے ملنے کے امکانات ہوں۔ خواجہ امیر خسرو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی عورت لوگوں کی تنقید سے بچنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ نامحرم کی صحبت سے اجتناب کرے اور اگر وہ کسی بھی طرح کے شبہ یا تنقید سے بالکل محفوظ رہنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ پردہ کرے۔“
دوسری جگہ بیان کرتے ہیں کہ عورت کی پاک دامنی اس وقت قائم رہ سکتی ہے جبکہ وہ بیرونی دنیا سے قطعاً تعلق نہ رکھے۔“

بچپن کی شادی کا رواج ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلم ممالک میں ہر خاص و عام میں پایا جاتا تھا۔ سلاطین دہلی اور تیموری خاندان میں یہ رواج عام تھا۔ شادی کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی ہاں اکبر نے ضرورت شادی کے لیے لڑکے کی عمر ۱۶ سال اور لڑکی کی عمر ۱۴ سال مقرر کر دی تھی مگر اس قانون پر زیادہ عمل نہ ہو سکا۔
کتاب میں مغل شہزادیوں، بیگمات اور اس زمانے کی دیگر اہم خواتین یعنی ہندو رانیوں کی زندگی کے ان پہلوؤں کو تاریخ کے آئینہ میں پیش کیا گیا ہے۔

| | | | | | |
|---|----------------------|---------|---|-----------------|-----|
| ۱ | تصنیف | ۳۹۲-۳۹۴ | ۲ | ملفوظات تیموریہ | ۲۸۹ |
| ۳ | برقی | ۵۰۶ | ۴ | مطلع الانوار | ۱۹۵ |
| ۵ | اعجاز خسروی، جلد دوم | ۳۱۶ | | | |

جن سے ہماری تمدنی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے اور اس کو شعور بخشنے میں مکمل مدد ملی اور وقت پڑنے پر اپنی بہادری کے میدان جنگ میں بھی ————— جوہر دکھائے سیاسی توازن برقرار رکھنے میں بھی اپنی قابلیت کا کامیابی کے ساتھ پورا مظاہرہ کیا۔ علم و ادب میں بھی کسی شہزادے سے پیچھے نہ رہیں انھیں پردہ نشین خواتین نے تہذیب و تمدن میں وہ خواہر پارے تیار کیے جو آج کی عورت کو رہنمائی کے لیے مکمل مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ملکی نظام میں قابل تعریف کام کیے اور سیاست میں توازن برقرار رکھے۔ اپنی قابلیت کا اظہار کیا اور دست سخاوت میں بھی ان کے ہاتھ کبھی کوتاہ نہیں رہے۔ مذہب کی پاسبانی کی کتاب میں نیموری شہزادیوں کی زندگی اور کردار کو مستند تاریخی کتابوں کی مدد سے سچی تصویر کو تحقیق کے نئے طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ کتاب میں مغل حرم کے ان رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے جن کی مدد سے مغل شاہی خاندان کی زندگی چلتی تھی اور حرم کے ماحول کی وہ تصویر بھی پیش کی ہے جس میں شاہی خاندان کے ذہنی سانچے ڈھلتے تھے شہزادیوں کے عقائد اور زندگی کی دلچسپیوں جن سے ان کے سماجی اور ثقافتی رشتے پیدا ہوتے تھے۔ ان کو واضح اسلوب بیاں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور پراز معلومات بنانے اور اس کام کو پورا کرنے کی اپنے طور پر میں نے ناچیز سعی کی ہے۔

میں نیشنل میوزیم دہلی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جس نے مجھے مغل شہزادیوں بیگمات وغیرہ کے فوٹو لینے کی اجازت فرمائی۔

روزِ ازل ہی سے عورت کی زندگی کے حالات میں عظیم انقلابات ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ویدوں کے اول دور میں عورت کو سماج میں اعلیٰ مقام حاصل تھا وہ شوہر کے ساتھ ”یگ“ میں شریک ہوتی تھی ویدوں کو پڑھتی تھی۔ ”اپالا“ اور ”انوپ مدرا“ وغیرہ عورتیں رشیوں کی طرح وید منٹروں کی رچنا کرتی تھیں، لیکن ویدوں کے وسطی دور میں عورتوں کو سماج میں کم تر سمجھا جانے لگا کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جہاں ”عورت کی

پو جا ہوتی ہے وہاں دیوتاؤ کا نواس ہوتا ہے۔“ ویدوں کے زمانے میں شوہر کی جائداد میں عورت کا حصہ ہوتا تھا۔ عہدِ تیموریہ میں عورت کو مکمل آزادی تھی پھر ایک سے زائد شادیوں اور سستی کا رواج شروع ہو گیا۔ گپت عہد میں بچپن اور بیوہ کی شادی شروع ہونے لگی شوہر کی جائداد میں حصہ سے بھی عورت کو محروم کر دیا گیا عورت کی تسلیم و تربیت کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی ابھی پردہ کا رواج بھی نہیں ہوا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہندو سماج میں بھی بہت سی تبدیلیاں آنے لگیں۔ یہاں ہندوستانی عورت کی حالت کو تحریر کیا گیا ہے تاکہ عورت کی زندگی میں ماضی کے انقلابات کی روشنی میں اس کی حالت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب میں کچھ گم نام شہزادیوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ان کی زندگی اور ان کے شاہی خاندان سے رشتہ کا صحیح علم ہو جائے ہمارے مصنفین نے تحقیق کر کے ان کے بارے میں صحیح تاریخ نہیں لکھی ہے جس کی وجہ سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ خاص طور سے غیر ملکی سیاحوں اور یورپ کے متعصب اور نامسمجھ مورخین اور ان کے غلام شاگردوں نے غلط پروپیگنڈہ کرنے کی وجہ سے بہت سے من گھڑت جھوٹے افسانے لکھ دیے ہیں جن سے صحیح تاریخ کا سراغ لگانے میں دشواری پیدا ہو گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی علم ہو جائے گا کہ مغل شہزادیوں کی شادی ہوا کرتی تھیں۔ جاہل مورخین نے ہر واقعہ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اپنی تحقیق کا موضوع بنا لیا ہے۔ کتاب میں یہ بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ پردہ نشین خواتین بڑے بڑے سورماؤں کو جنم بھی دیا اور خود بھی جواں مردی کے جوہر دکھائے علم و ادب تہذیب و تمدن اور مذہب کی پاسبانی میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔

خاندانی جھگڑوں کو ختم کرا کے ملک و قوم کو تباہی اور بربادی سے بھی بچایا۔ جن خواتین کی سوانح کتاب میں پیش کی جا رہی ہیں وہ شرافت النفس خدمۃ الناس

اور ذاتی ایثار و قربانی کے اعتبار سے تاریخ ہند میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں اسکے خوبصورت خصائل ہم اپنے ملک کے طبقہ و نسواں میں دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ کتاب کے لکھنے کا مقصد ہے کہ جدید دور کی خاتون مذکورہ خواتین کی زندگی اور کردار سے متاثر ہو کر اندھیرے سے اُجالے کی جانب لوٹ آئے۔ کتاب میں ان ہندو رانیوں کا مختصر تعارف تحریر ہے جو کسی بھی طرح مغل شہزادوں سے حسن و جمال، قابلیت اور بہادری میں — کم نہیں تھیں۔ اور ہند کی مایہ ناز خواتین میں ان کا نام سنہرے الفاظ میں تحریر ہے۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن کی مدد سے کتاب مکمل کی گئی ہے تمام حوالے انھیں مستند تاریخی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ کتاب میں جن خواتین کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنی دانشمندی اور پاکدامنی کی ضمانت خود آپ تھیں۔

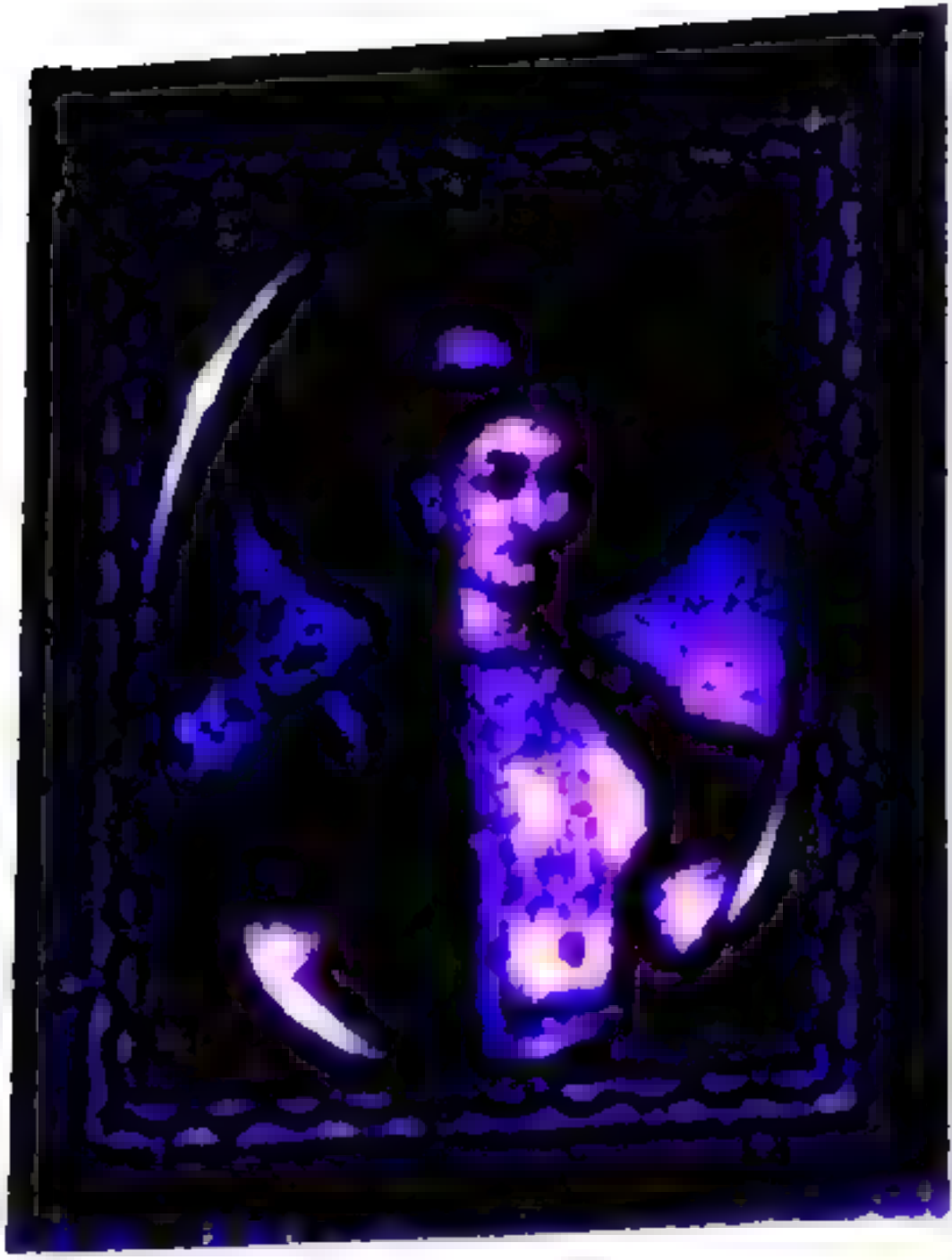
میں محترم ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، محترم جوگیندر پال، محترم تنویر احمد علوی، محترم گوپی چند نارنگ، محترم منصور احمد عثمانی، (سکرٹری اردو اکادمی دہلی)، ڈاکٹر صادق صاحب اور سید ظہیر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھیں حضرات نے میرے دل میں اس کتاب کے لکھنے کے جذبات پیدا کیے اور اپنی نیک دُعاؤں سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

خدا سے دعا گو ہوں کہ کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے، آج عورت کی بگڑتی ہوئی زندگی کے لیے مفید ثابت ہو۔

محمد علی

بشکریہ نیشنل میوزیم دہلی

مغل خاندان کی نامور بیگمات



ذکیہ خاتون



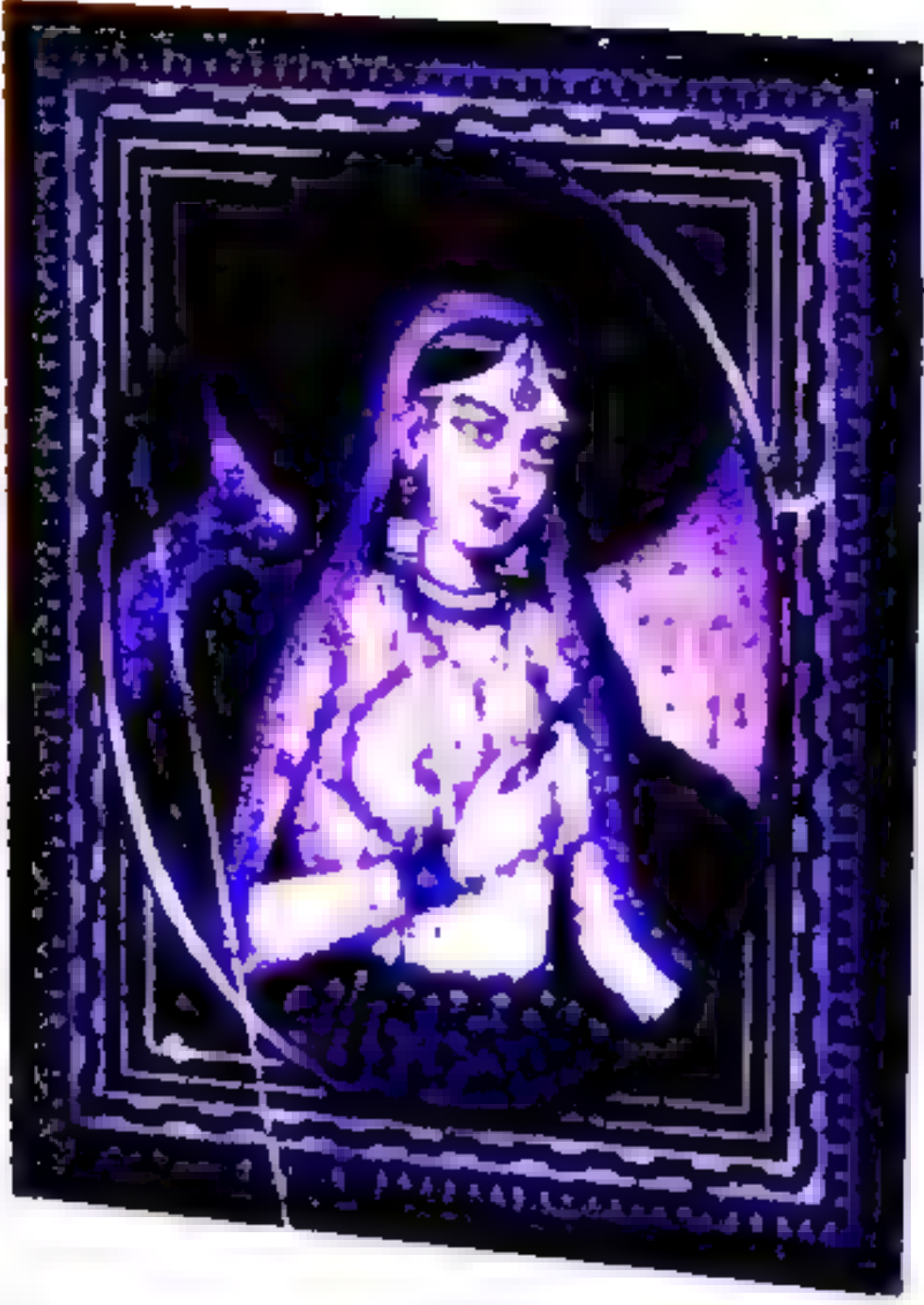
حسینہ بیگم



سکینہ خاتون



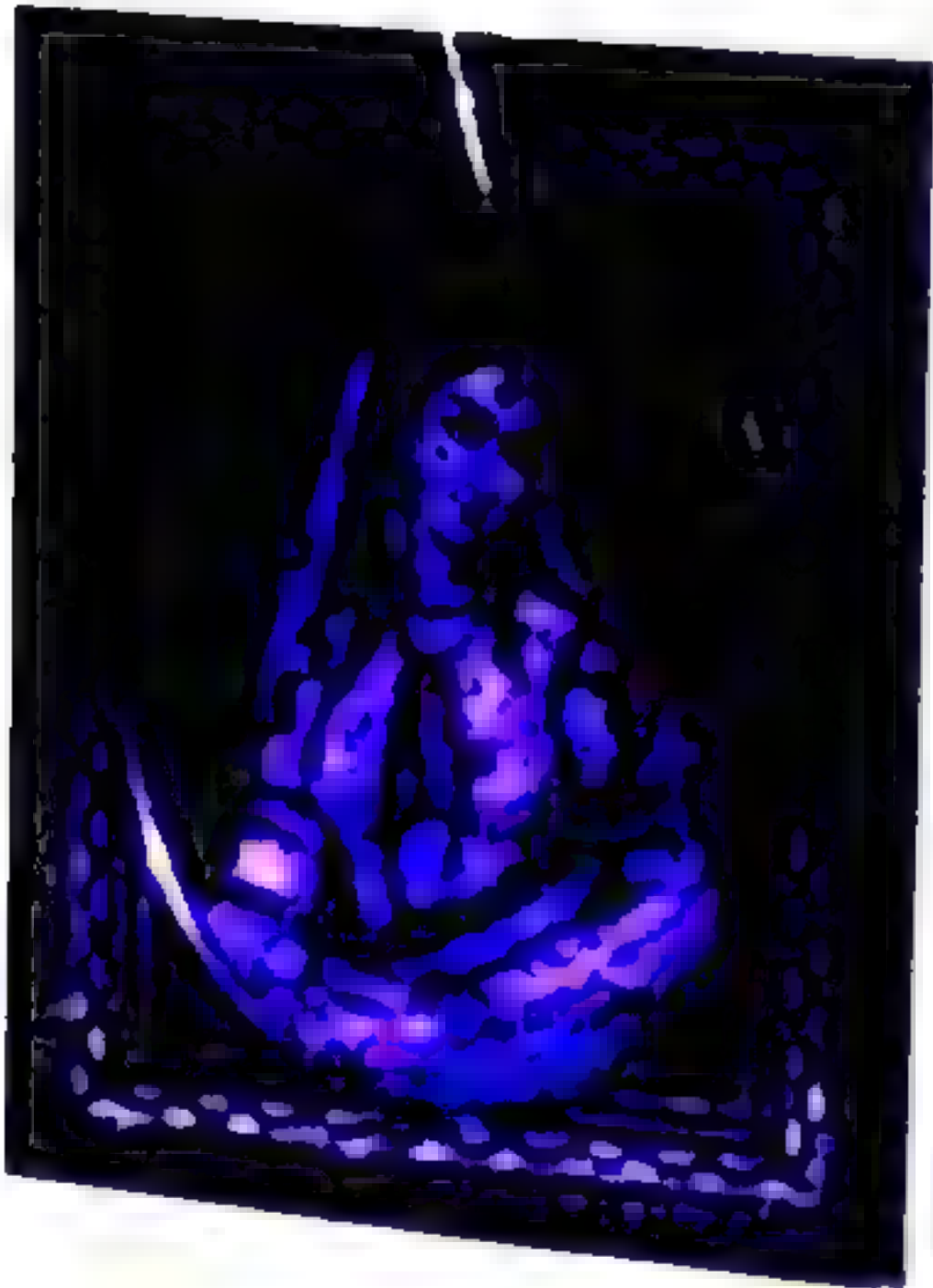
صبیہ خاتون



نورالدين صاحبه



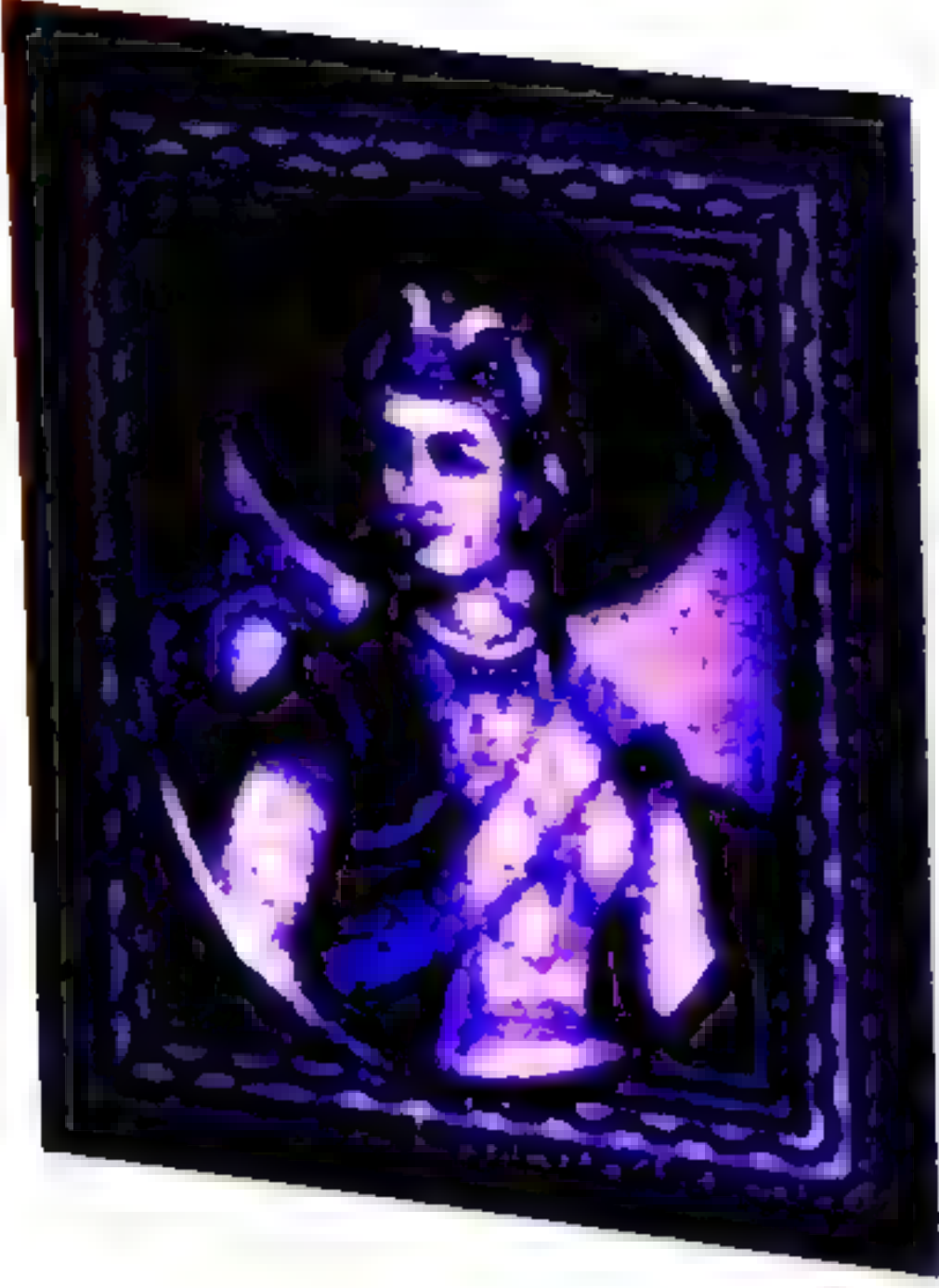
ممتاز محل



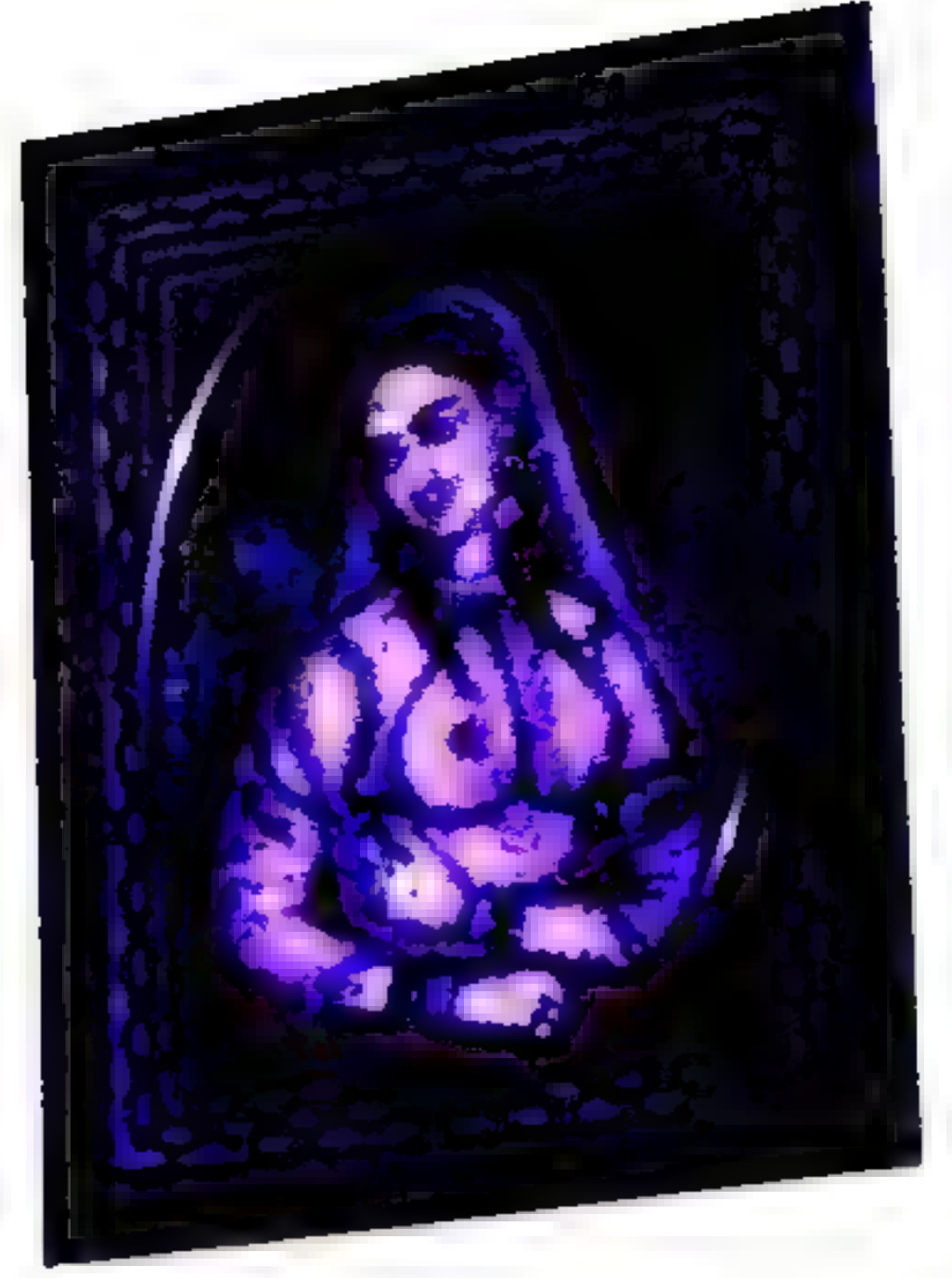
فرجه، سک



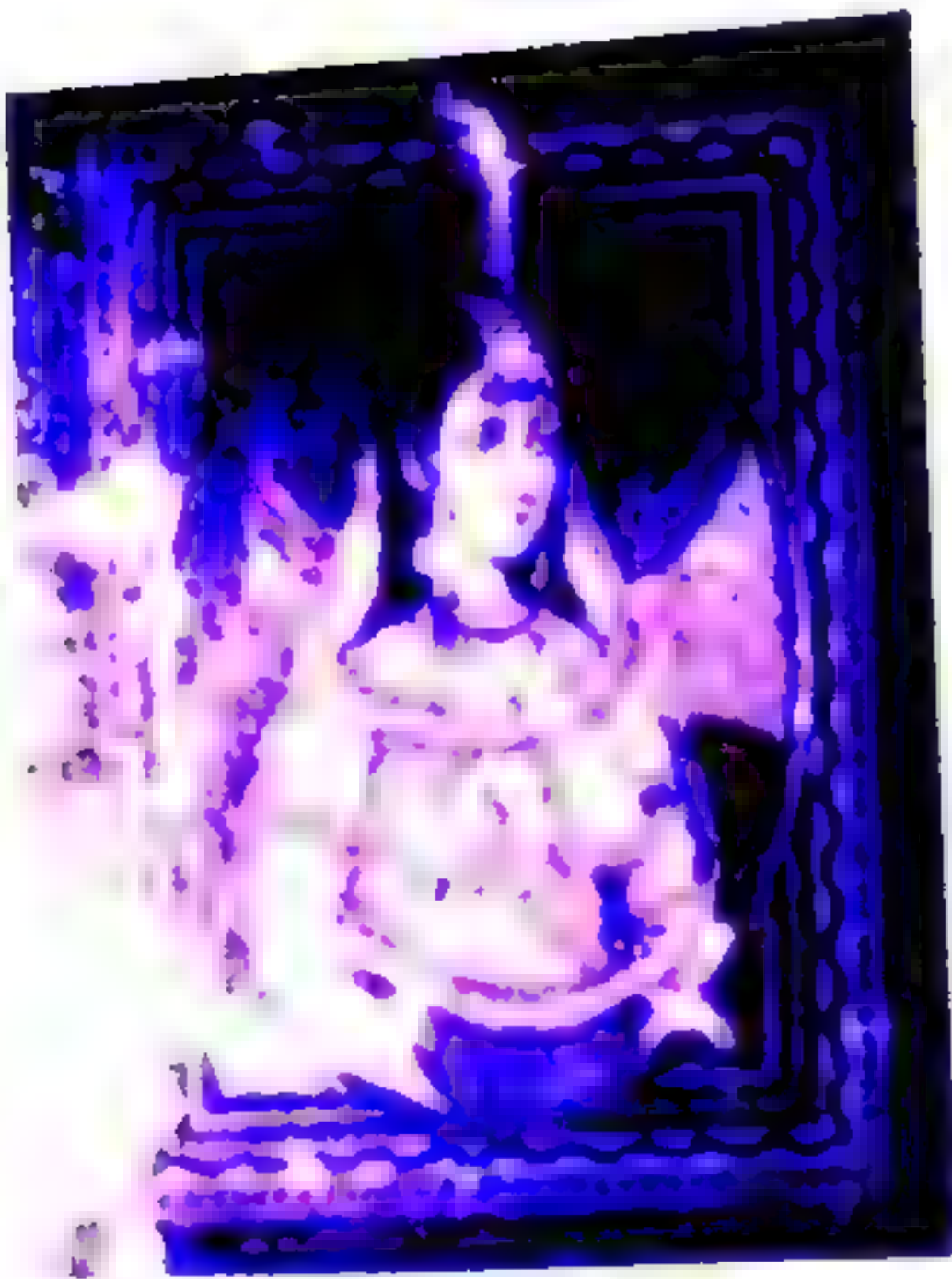
مان بائی



عاسیہ خاتون



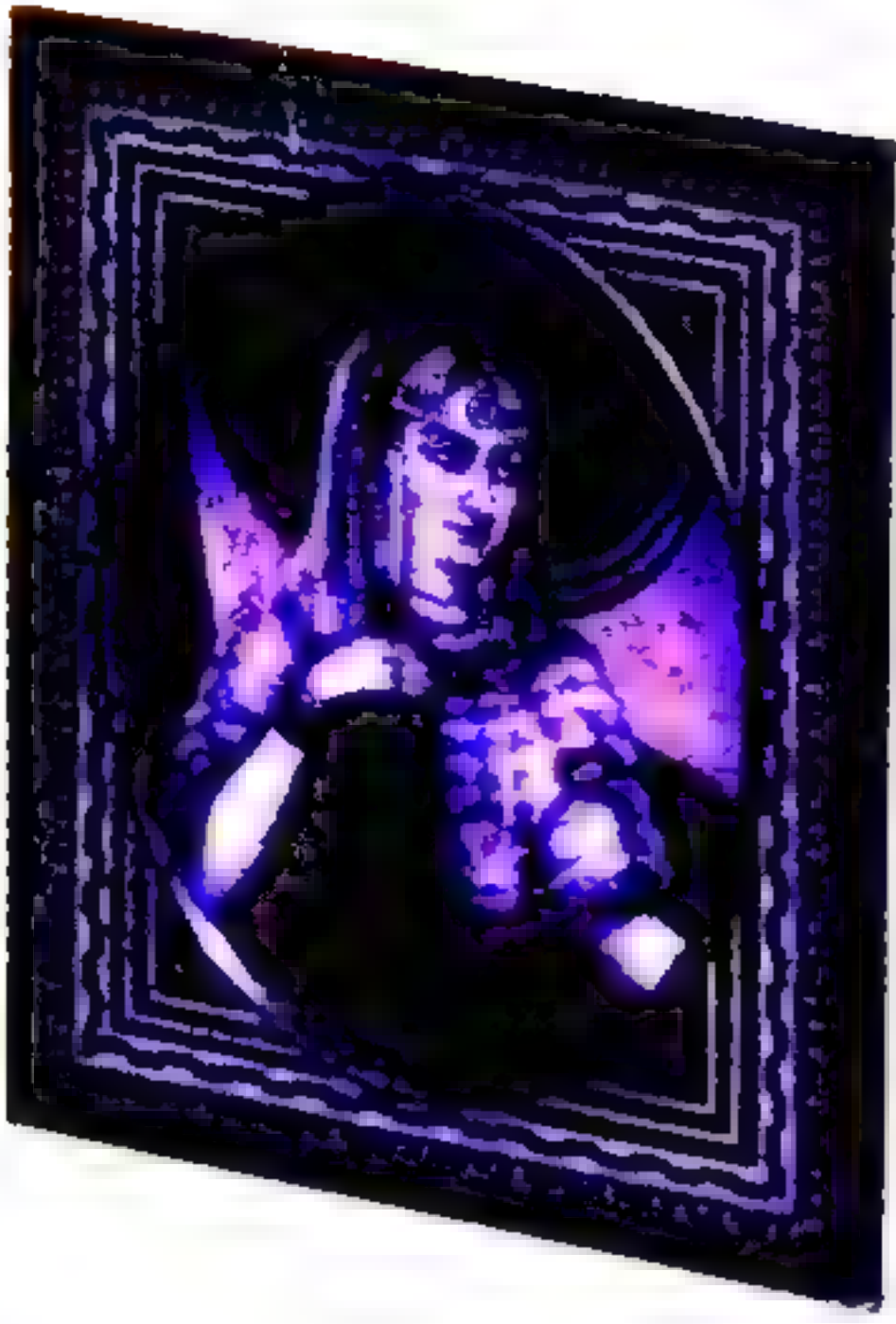
شائستہ بانو



سعیدہ خاتون



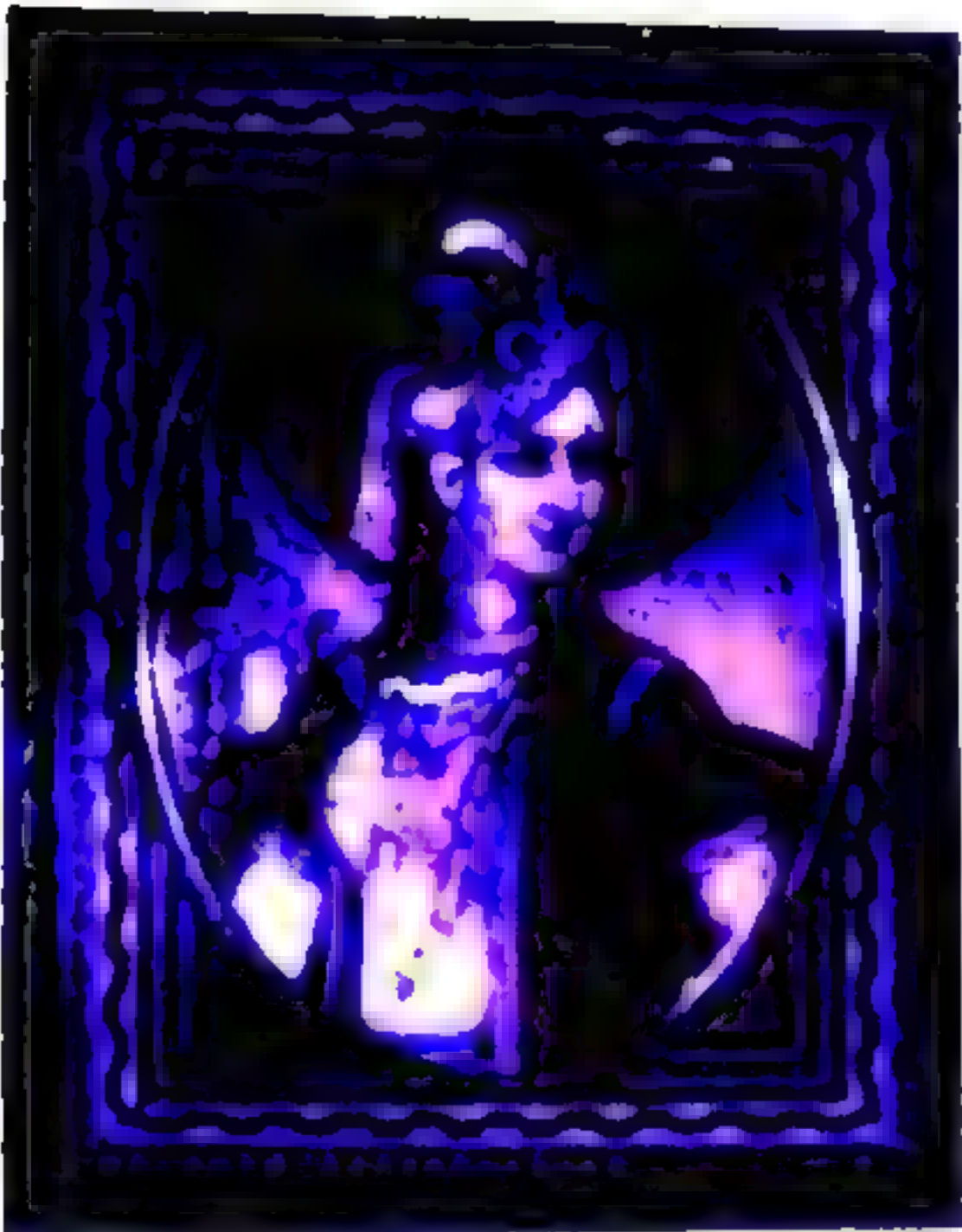
نور جہاں بیگم



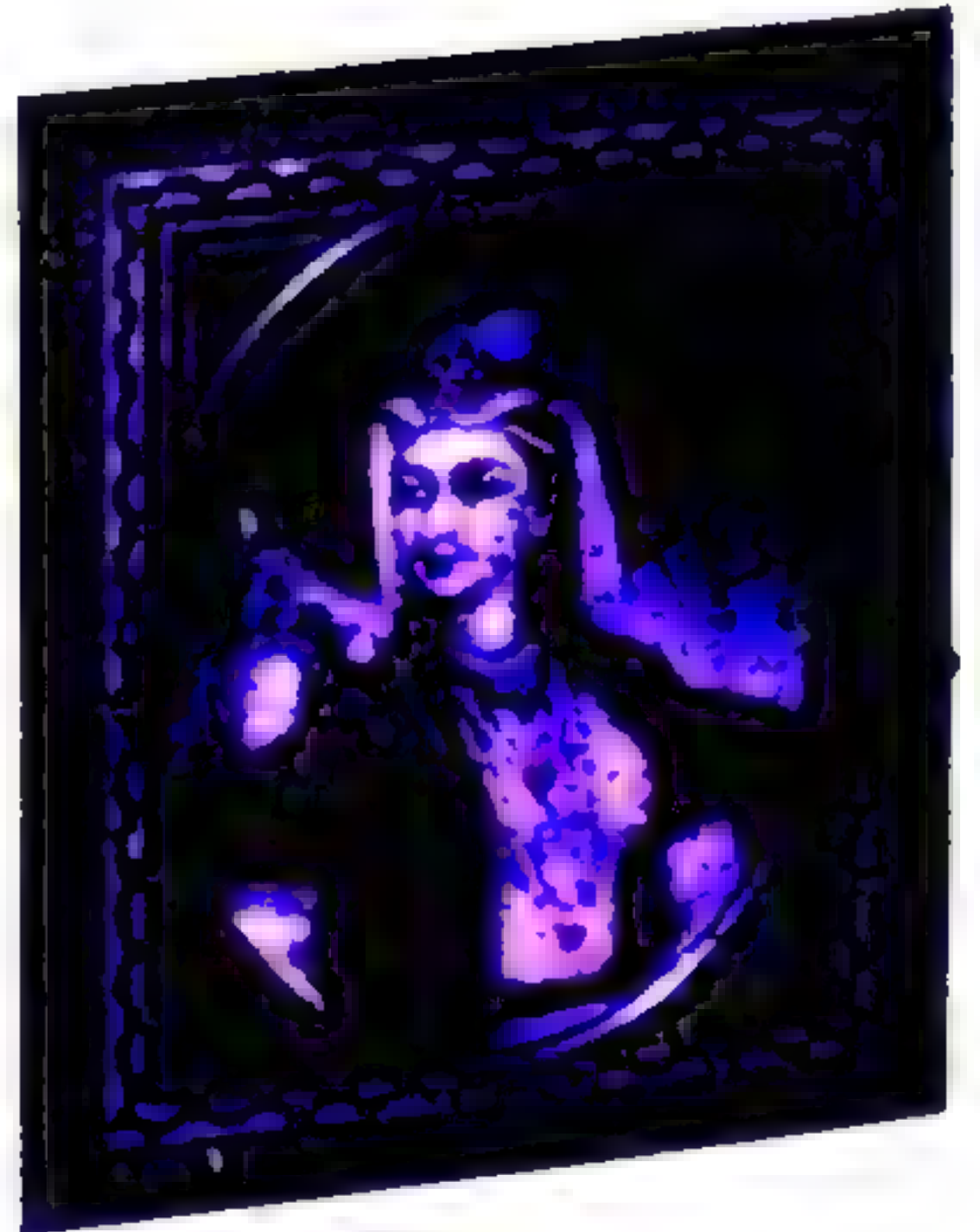
ممتاز محل



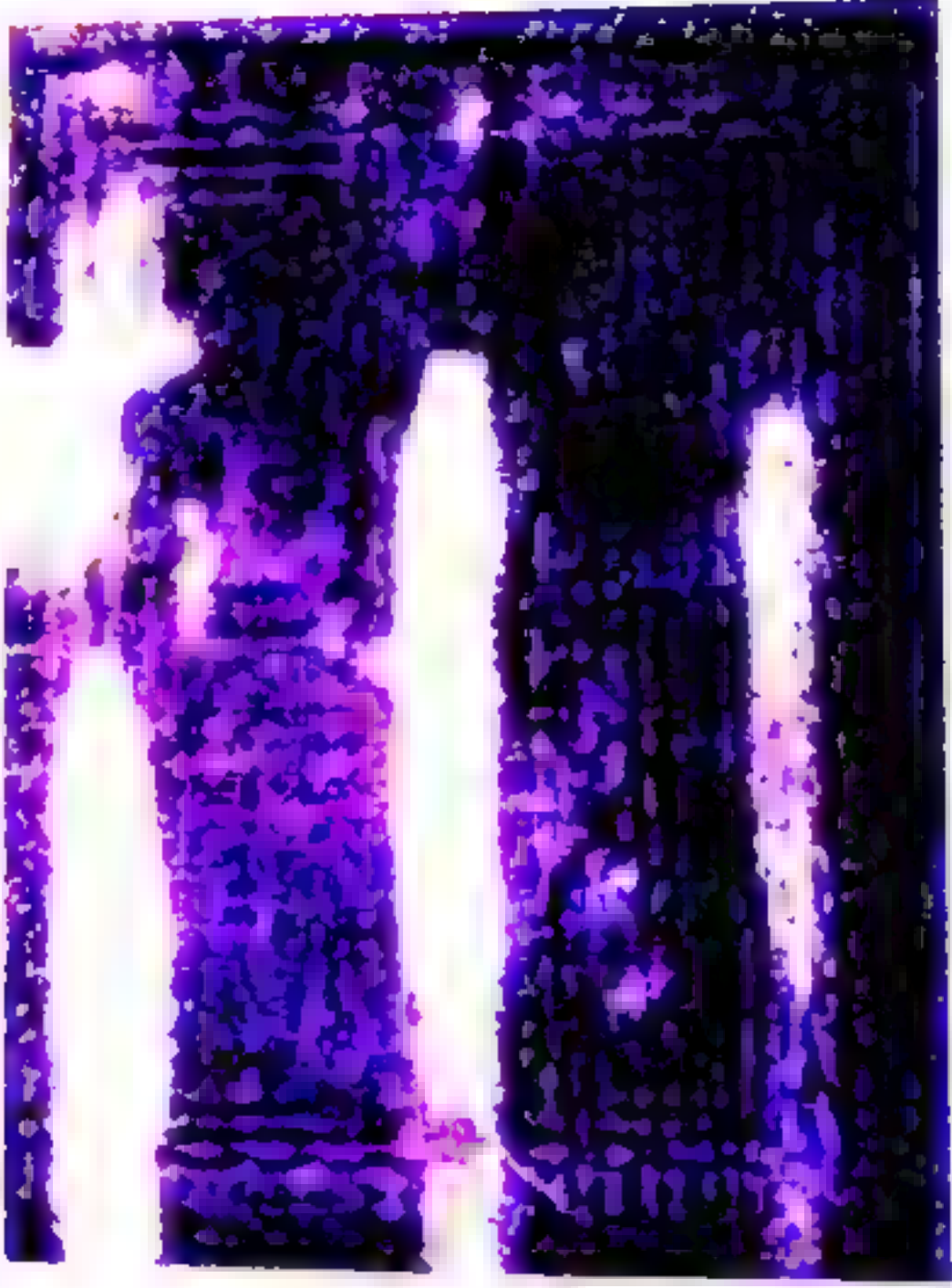
عباسی خاتون



سکندر جہاں



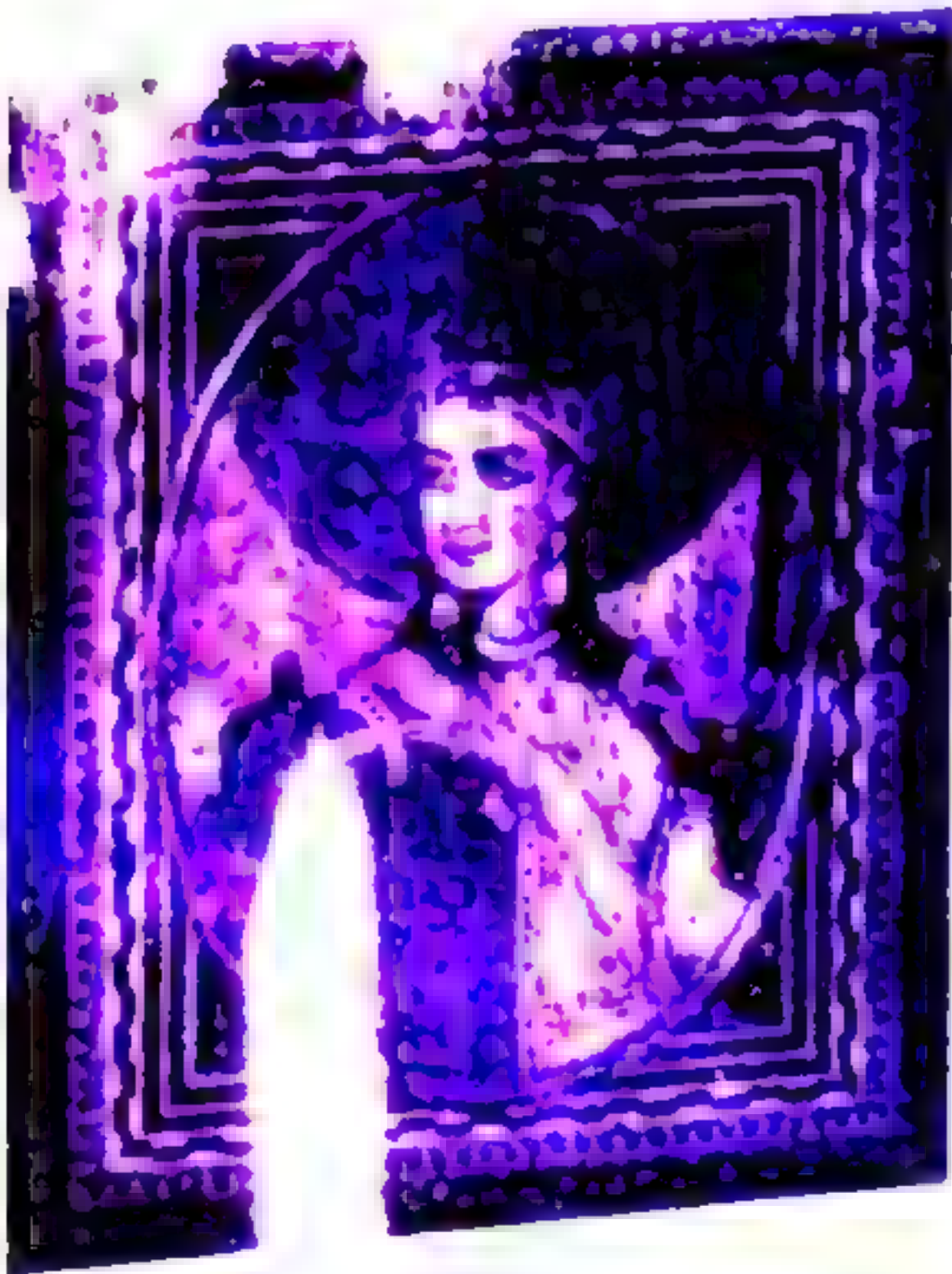
بروز بانو



عاد بانو



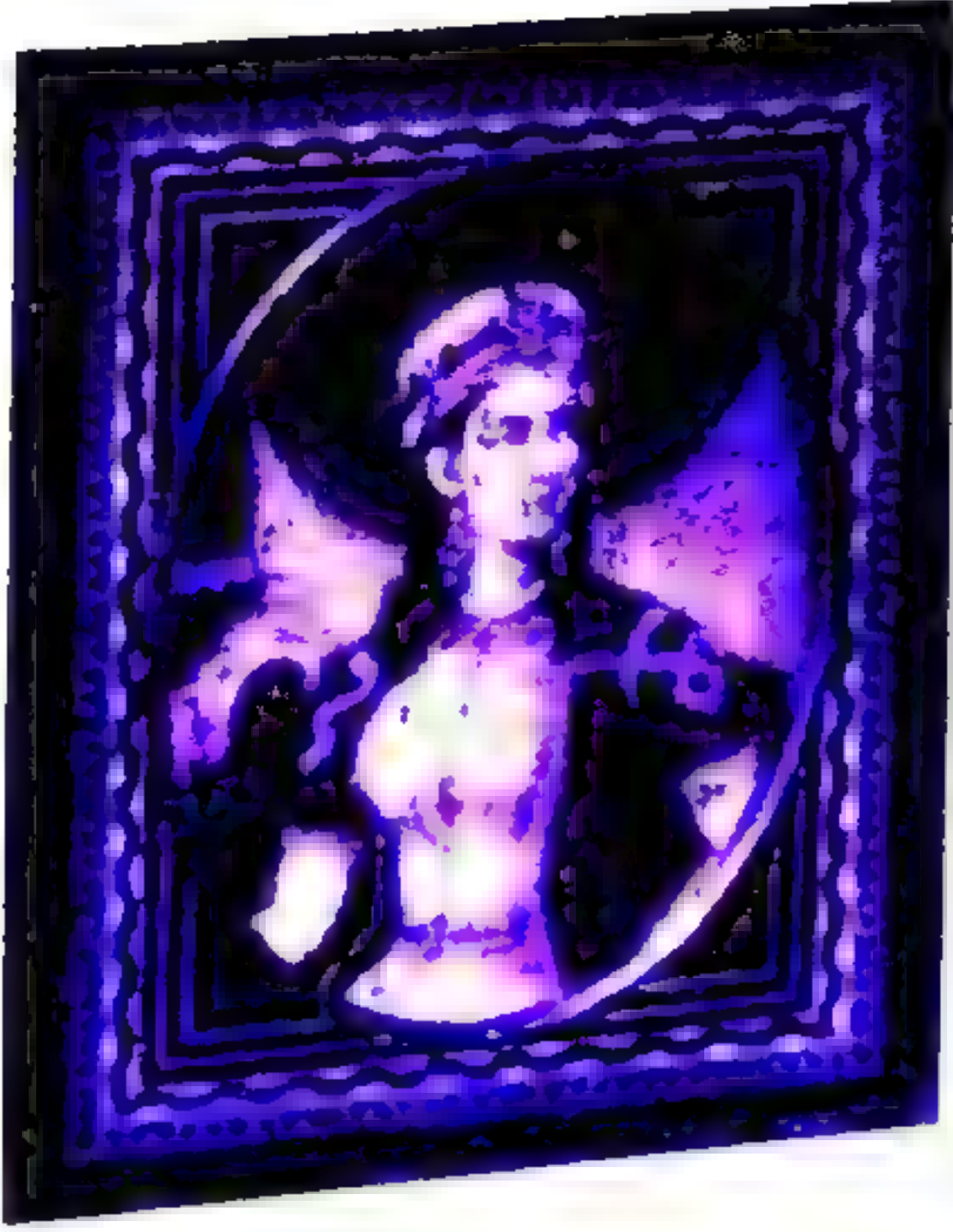
رانی چندرما (جودھا بانی)



یہ حب



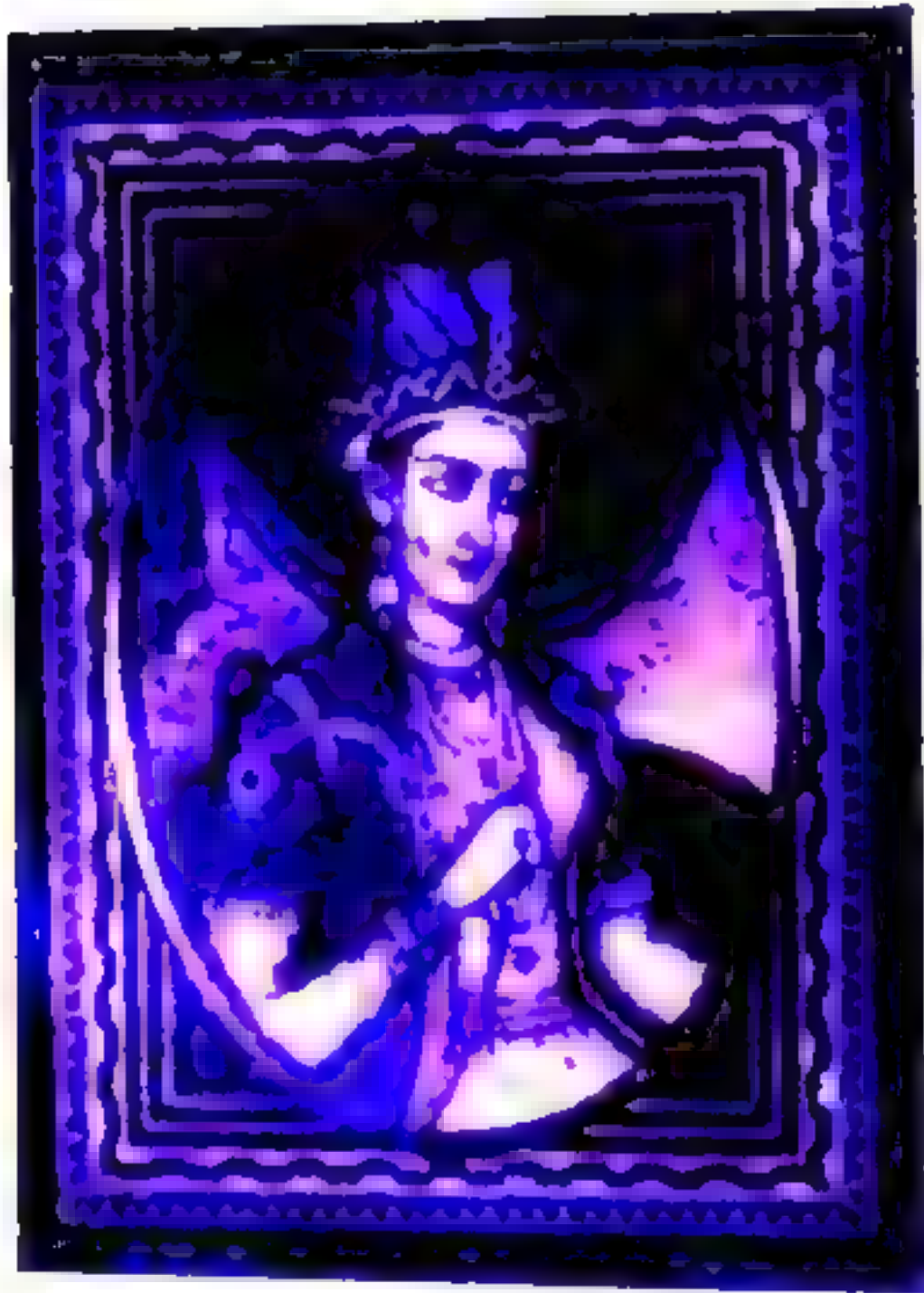
جمیلہ بانو



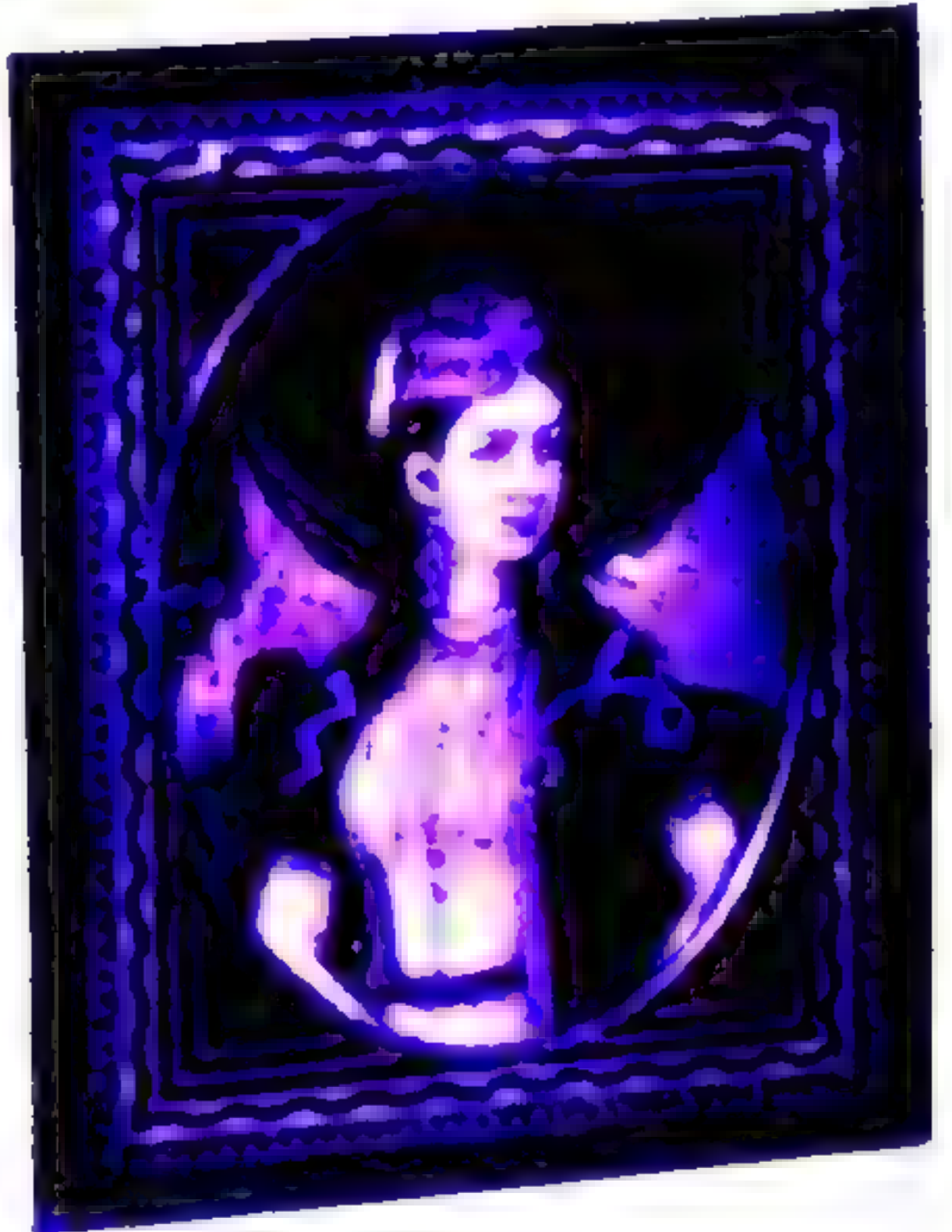
سنیہ بانو



اختر جہاں



انور زمانی



شرف افزا بانو



شہنشاہ باب کی بیٹی۔ گل بد۔ بگد

گلابدن بیگم

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیسری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیسری حیات

اسلامی تمدن نے جہاں اور بہت سے احسان کیے ہیں وہاں نسوانی زندگی میں بھی انقلابِ عظیم پیدا کر کے اسے قابلِ رشک بنا دیا قرونِ وسطیٰ کی بہت سی نسوانی تحریکات اسلامی تمدن کے صدائے بازگشت ہیں اسلام نے عورتوں کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے اس حسین لطیف کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ تیموریہ میں بعض قدسی منش شہزادیوں نے تمدنی ترقی میں ہی نہیں بلکہ حکومت کے کام میں بھی مدد فرمائی۔

گلابدن بیگم شہنشاہِ بابر کی بیگم دلدار بیگم کے بطن سے ۱۵۲۳ء کو کابل میں پیدا ہوئی۔ دلدار بیگم المقلب۔ آغاچہ ایک چغتائی خاتون آغاچہ کا اصل نام مبارک بی بی تھا منصور یوسف زنی کی بیٹی تھی۔ گلابدن بیگم ہمایوں کی ہمیشہ اور اکبر اعظم کی پھوپھی تھی۔ بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کی عمر دو سال کی تھی اور بابر کی وفات کے وقت وہ آٹھ سال کی تھی سید صباح الدین نے بزمِ تیموریہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۷ پر بحوالہ فہرست کتب قلمیہ فارسیہ عجائب خانہ برطانیہ لندن مولفہ ڈاکٹر طپارس ریویو جلد دوم ص ۴۴ سے مذکورہ بالا سن پیدائش قلمبند کی ہے۔ گلابدن بیگم کا اپنا بیان ہے کہ جس وقت حضرت فردوس مکانی کا انتقال ہوا۔ یہ فقیر آٹھ سال کی تھی۔ جب وہ دو سال کی تھی تو بابر کا لڑکا مرزا فاروق جو ماہم بیگم کے بطن سے۔ پیدا تھا انتقال ہو گیا ماہم بیگم ہمایوں کی والدہ اور بابر کی بیٹی بیگم تھی جب ماہم بیگم بیٹے فاروق کی موت کے بعد بہت غمگین رہنے لگی تو گلابدن بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ گلابدن بیگم کی شادی خواجہ خضر خان مغل سے ۱۶ سال کی عمر میں ہوئی۔ گلابدن بیگم کا سگا بھائی مرزا ہندال تھا۔ بچپن میں گلابدن بیگم ماہم بیگم سے ہی وابستہ رہی ماہم بیگم بھی گلابدن کو بہت پیار کرتی تھی۔ جس وقت شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تو گلابدن بیگم اگر وہ سے لاہور اور وہاں سے کامراں کے ساتھ کابل چلی گئی۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۵ء کو گلابدن بیگم کابل سے دوبارہ ہندوستان

چلی آئیں۔ اور اب ہمیں رہنے لگیں۔

اعلیٰ تعلیم اور اس پر ذوق قلبی اور مذاق سلیم نے اس کی طبیعت میں وہ جوہر پیدا کیے کہ گلبدن بیگم علم الانشاء اور شاعری میں بقائے دوام کا تاج حاصل کر چکی ہے۔ وہ علم دوست اور علم پرور تھی وہ عالموں کی بہت قدر کرتی تھی۔

اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے ”پیوستہ ارباب نیاز و اہل حاجت از خوان نواں ایشان بہرہ ور می گشتند“ ۱

گلبدن بیگم شریعت کی پابند غریبوں اور بے کسوں اور لاوارث لڑکیوں کی پرورش میں حصہ لیتی تھی اور ان کی شادی کا انتظام کرتی تھی، حاجیوں کے لیے سامان مہیا کرتی، اہل اللہ اور فقراء کے لیے وظائف بہم پہنچاتی تھی وہ ایک زبردست شاعرہ بھی تھی۔

جب جدت طبع، شوئے ذہانت اور وار دات قلب اس کے دل میں طوفان جذبات پیدا کرتے تو وہ شعر کہتی تھی، اس کے شعر برق بن کر اقلیم دل کو ہلا دیتے تھے اور جذبات میں ہل چل پیدا کر دیتے تھے۔ اشعار اصلیت کے رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے، اس کے کلام کا نمایاں جوہر راست و روانی ہے۔ اشعار موتیوں کی طرح چمکتے ہیں جو تصنع اور جلا کی اسعانت سے بالکل مستثنیٰ ہیں، ۲

گلبدن محبت کے بغیر زندگی کو بدمزہ بتاتی ہوتی یوں ادا کرتی ہے : ۳

ہر نگارے والدہ او با عاشق خود یار نیست

تو یقین می دانی کہ بیچ از عمر خود دار نیست

گلبدن کی شاعری میں سادگی، عام فہم الفاظ دل نشیں مضمون اور محاورہ بندی نے کلام میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ افسوس آج اس کا دیوان صفحہ عالم سے ناپید ہے تاہم نکتہ کا سراغ لگا کر پیش کش ارباب ذوق ہے یہ

”کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است
 کلید قفل دل ماتم یار است
 نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارض زلف
 دل کسے کہ بہ حسن داد اگر فتار است“

گلبدن نے ہمایوں سے متعلق بہت سے واقعات تو خود آنکھوں سے دیکھے تھے اور بہت سے واقعات کی معلومات ماہم بیگم سے ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لیے گلبدن بیگم کی معروف کتاب ”ہمایوں نامہ“ کی بہت اہمیت ہے۔ گلبدن نے ہمایوں نامہ اکبر کے اصرار کرنے پر لکھا جو فارسی زبان میں ہے مگر چغتائی ترکی زبان کے الفاظ زیادہ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ کیوں کہ مغلوں کی زبان چغتائی ترکی تھی۔ گلبدن کے حمیدہ بانو بیگم (ہمایوں کی بیوی) سے بھی بہت قریبی اور اچھے تعلقات تھے اس لیے بہت سے تاریخی واقعات کی ذاتی اور معتبر معلومات تھیں۔ تیموری شہزادوں کی علمی بزم کی فہرست میں سب سے پہلے گلبدن کا نام ہے۔

بابر کے شہزادوں ہمایوں، کامراں ہندال اور عسکری نے علم و ادب اور شعر و شاعری کا ذوق، میراث میں حاصل کیا تھا اسی ماحول میں گلبدن بیگم نے پرورش پائی اور یہی خاص وجہ تھی کہ گلبدن بھی ترکی فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت رکھتی تھیں اور گلبدن بیگم اعلیٰ شاعرہ اور انشاء پرواز ہوئی ’گلبدن بیگم کا‘ ہمایوں نامہ‘ — ہمایوں عہد کے تمدن، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لیے بے مثل کتاب اور قیمتی ماخذ ہے۔ ہمایوں نامہ اکبر نامہ کی ترتیب و تدوین کے وقت بابر اور ہمایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی گئی تھی مگر اپنی خاص خصوصیات کی بنا پر ایک اہم تالیف بن گئی۔

۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانہ میں گلبدن کا ہمایوں نامہ بالکل نیست و نابود ہو گیا تھا۔ مگر خوش نصیبی سے اس کا ایک نامکمل نسخہ کربل جارج ولیم ہملٹن کے ذریعہ ۱۸۶۷ء میں برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں پہنچ گیا۔ ہمایوں نامہ کے ترجمہ کے حرف آغاز میں رشید ندوی صاحب نے بیباک کہا ہے کہ ”فدر میں شریک ایک انگریز کربل جارج ولیم ہملٹن نے یہ مسودہ دوسرے

قیمتی مسودات کے ساتھ دہلی میں مالی غنیمت کے طور پر پایا پھر ان کی بیوہ نے دوسرے مسودات کے ہمراہ برٹش میوزیم کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر چارلس ریو نے اس پیش بہا تصنیف کا تعارف اہل علم سے کرایا۔ ۱۹۰۲ء میں سنراہینٹ ایس۔ بیورج نے اسے حواشی و تراجم کے ساتھ مجلہ کر کے رائل ایشیائیک سوسائٹی لندن کی طرف سے شائع کرایا۔ اب یہ کتاب عام ہے اور کئی علم دوست خاتون یونیورسٹیوں میں بطور نصاب رائج ہے۔ بیورج نے ہمایوں نامہ کے نسخوں کو یکجا کیا اور ایڈٹ کر کے ۱۹۰۲ء میں انگریزی ترجمہ کر کے لندن میں شائع کرایا۔

ہمایوں نامہ کے دیباچہ میں خاتون نے ہمایوں کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے اور کتاب میں جتنے بھی بیگمات کے نام آئے ہیں سب کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے اس پر ایک تفصیلی ریویو لکھا ہے مولانا مرحوم نے ہمایوں نامہ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے گلبدن بیگم کے عدیم المثال ادیب اور مورخ کی تحریر روشنی میں کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہمایوں نامہ کی انشا پردازی کے بارے میں مولانا شبلی تحریر کرتے ہیں :

”... فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وفاتِ نعمت خاں ان پر نثار کر دی جائیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے چھوٹے چھوٹے فقرے سادہ اور بے تکلف الفاظ روزمرہ کی عام بول چال طرزِ ادا کی بے تکلفی ساختی، دل کو بے اختیار کر دیتی ہے۔“

ہمایوں نامہ میں عبارت کی سادگی اور طرزِ ادا کے بے ساختہ ہونے کی مثالیں بکثرت ہیں روزمرہ کے محاورے کتاب میں اکثر استعمال ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو :

پاٹے داد : ہار جاتا ہے ۔
 طرفگیاہمی کرد : سوخیاں کرتا ہے ۔
 بپاشد تا یکدم را وریا ہم : آؤ گلے لگیں ۔
 خفتن شد : سونے کا وقت آیا ۔

سر حضرت شوم : آپ پر قربان ہوں وغیرہ وغیرہ
 گلبدن بیگم نے اس عہد کی تمدنی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا ہے جب وہ کسی جلسہ یا شادی کی تقریب کا حال بیان کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سچی تصویر کھینچ دیتی ہیں وہ عورتوں کے بارے میں بھی نئی معلومات فراہم کرتی ہیں مثلاً عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی فنونِ سپہ گری میں قابلیت رکھنے کی خوبی کو بھی بیان کیا ہے عورتیں سفر اور سیر و شکار میں گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں، بعض اوقات مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں، گلبدن بیگم نے عورتوں میں مختلف ہنر رکھنے کو بھی بیان کیا ہے جیسے : زہ گیر تراشی، چوگان بازی، تیر اندازی اور ساز بجانا وغیرہ فنون میں ماہر تھیں عورتیں مردوں کے ساتھ گانے میں بھی شریک ہوتی تھیں مگر صرف خاندان والوں کے ساتھ نامحرم کے ساتھ وہ شامل نہیں ہوتی تھیں بے گانوں کے ساتھ مل کر گانے کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔

ایران کے سفر میں گھوڑے پر سوار ہمایوں کے ساتھ اس کی ہمیشہ بھی شریک تھی، ماہم بیگم جب کابل سے ہندوستان آئیں تو باہر خود دو کوس پیدل ان کے استقبال کو جاتے گلبدن کے ہمایوں نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکی نظام اور دیگر اہم معاملات میں عورتوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔
 مولانا شبلی ہمایوں نامہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”گلبدن بیگم اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں کہ کس واقع کو سمیٹ کر اور کس واقع کو کھیل کر لکھنا ہے وہ واقعہ کے اثر انداز کرنے کی کیفیت اور

اس کے تاثرات سے واقفیت رکھتی ہیں۔

قلمی نسخہ (ہنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور قلمی نسخہ دارالمصنفین مخزن الغرائب میں گلبدن بیگم کا نام شعرا کی فہرست میں تحریر ہے لیکن دونوں تذکروں میں بیگم کا صرف ایک شعر منقول ہے اور مسنر ہیورج نے اس شعر کو ہمایوں نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے تذکرۃ النخواتین سے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو :

ہر پری روئے اوبا عاشق خود بار نیست

تو یقین می داں کہ پیچ از عمر بر خور دار نیست

گلبدن بیگم اپنے سگے بھائی مرزا ہندال کی حسرت ناک موت کو یاد کر کے بار بار مندرجہ ذیل شعر پڑھتی تھی :

”اے دریا اے دریا اے دریغ

آفتابم شد نہا در زیر میغ

گلبدن بیگم کے عالم نزاع میں مریم مکانی اس کے سر ہانے کھڑی تھی دونوں میں بڑی محبت تھی۔ مریم مکانی گلبدن بیگم کو جیو کہہ کر بار بار پکار رہی تھی گلبدن نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور مریم مکانی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ مصرع پڑھا :

”من زار لمبر دم عمرت بادار زانی“

ابتدائی دور ہی سے جبکہ سلطنت اور تہذیب و تمدن کا آغاز ہو رہا تھا مغل حکمران شہزادوں کے ساتھ شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ گلبدن بیگم کے علم و ادب کا ذوق اس بات کا ثبوت ہے اس کے علاوہ مغل بیگمات اور شہزادیوں کی تصنیفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کی تعلیم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمایوں نامہ اس زمانہ کی واقع نگاری کا بے مثال ثبوت ہے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ گلبدن بیگم تاریخ نویسی کی ذمہ داری سے کس قدر واقف ہے، "گلبدن بیگم کی تحریریں صداقت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ تحریر کرتی ہیں کہ فلاں واقع میں نے فلاں شخص سے سنا ہے اپنے چشم دید واقعات کو پورے یقین کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یورپ کے مورخین روایت کے سلسلے کو زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کرتے بہت ہی مختصر بیان کرتے ہیں جبکہ ایشیائی مورخین صرف جنگ و جدل کو پوری تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور عرب مورخین کا مذاق روایت کے سلسلہ کو آخر تک پہنچانے کا ہے عورت ہونے کی وجہ سے گلبدن بیگم نے معاشرتی اور تمدنی زندگی سے متعلق واقعات کو تحریر کرنا ہی اپنا مذاق بنایا اور جنگ و جدل میں کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

گلبدن بیگم نے حمیدہ بانو کی ہمایوں سے شادی کا واقع بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے کہ حمیدہ بانو بیگم بہت مشکل سے شادی کے لیے راضی ہوئی تھی۔ حمیدہ بانو بیگم سے جب شاہ بیگم نے کہا کہ آخر کسی کے پتے سے تو بندھے گی تو کہنے لگی کہ ہاں اس سے بندھوں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچے نہ کے اس سے کہ میرا ہاتھ اس کے دامن تک بھی نہ پہنچے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شادی کے معاملے میں پوری آزادی تھی خواتین بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں وہ نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اس بیان سے اس زمانہ کا پردہ شکن گردہ مایوس ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں بغیر نقاب اور برقع کے عورتیں باہر نہیں جاتی تھیں ہمایوں نے نکاح سے پہلے جب حمیدہ بانو بیگم کو بلایا تو بیگم نے کہا آداب سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ بادشاہ کو سلام کے لیے جا چکی ہوں دوبارہ جانا محرم کے سامنے جانا ہے چنانچہ حمیدہ بانو بیگم کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

”دیدن بادشاہ یک مرتبہ جائز است۔“

دو مرتبہ دیگر نامحرم است ہی نمی آیم۔“

گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائی سلطنت میں بادشاہ نہ صرف تخت پر بلکہ خانگی زندگی میں بھی بادشاہ ہوتا تھا۔ اگر دربار میں بادشاہ کا بچہ بھی جاتا تو وہ

باپ کی گود میں نہیں بلکہ شہنشاہ کے دربار میں جاتا تھا۔ یہ بادشاہ پرستی اور شہنشاہ پرستی کی آخری حد ہے اور قومی زندگی کی یہ آخری علامت ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ حالت نہ تھی، بابر اور ہمایوں اسی طرح اپنے عزیز واقارب اور قریب بھائیوں سے اسی طرح ملتے تھے جس طرح ایک آدمی اپنے پیارے عزیزوں سے ملتا ہے۔

گلبدن نے اس طرح کے واقعات کو بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کہتے ہیں کہ ”ایسے موقعوں کے بیان سے گلبدن کے قلم سے آپ حیات ٹپکتا ہے“ ہمایوں کی بیماری کے موقع پر جب گلبدن بیگم بھائی کی تیمارداری کو جاتی تو یوں بیان کرتی ہے :

”ایں حقیر ہمراہ ہمیشہ با ملازمت آن حضرت فرشتہ خصال رفتہ کر دم
ہر گاہ آن حضرت بہوش خویش می آمدند از زباں در افشان خویش
پرکشش می فرمودند کہ خواہران خوش آمدید بیانیہ تا یکدگر در رہا ہم
کہ شمار اور نیافتہ ایم“

ایک اور موقع پر ہمایوں گلبدن سے کہتا ہے گلبدن کی ہی زبانی سنئے :

”ایں حقیر را دیدند و فرمودند کہ اول ترانشا ختم از برائے آنکہ وقتہ
کہ لشکر ظفر اثر بہ گور ہنگالہ کشیدہ بودم طانی پوشش بودی“

گلبدن کے ہمایوں نامہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترکی زبان کی جگہ فارسی نے لے لی۔ اور فارسی زبان کو فروغ ملنے لگا۔ ہمایوں نامہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں شہزادیاں ٹوپی پہنتی تھیں۔ مرزا کامراں کے اندھا کرنے اور ہمایوں کی رحم دلی کو بھی گلبدن نے بڑے صاف طور سے بیان کیا ہے : ہمایوں نامہ کے اردو ترجمہ کے درپاچہ میں عثمان جید تحریر کرتے ہیں کہ :

”ہمایوں نامہ کی تاریخی حیثیت و اہمیت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے“

اس کتاب کی تحریر بھی مصنفہ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے لکھنے والی ایسی خاتون ہے جو ان عظیم ہستیوں کے ساتھ شامل ہے جن کے کارناموں سے صفحات تاریخ درخشاں ہیں، ان کا دائرہ علم باہر کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس اندرونی دائرہ میں بھی قدم رکھتی ہے جس سے اکثر مورخین نا آشنا ہیں اور مورخین کی طرح وہ باہر کے اسٹیج پر نظر نہیں رکھتی بلکہ پس پردہ بھی دیکھ سکتی ہیں، جنگ اور فتح و شکست کے حالات بہت سی تواریخ میں موجود ہیں۔ ہمایوں نامہ کی خوبی ان واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ اس کے قابل قدر وہ قصص میں جو ہمیں ان کی شخصیت ان کی عادات، ان کے احساسات کی ایسی جھلک دکھاتے ہیں کہ جس سے ان کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے گلبدن بیگم کی کتاب میں ہمایوں بادشاہ اور بابر بادشاہ اور ان کے متعلقین کی بابت بہت سی روزمرہ کی باتیں ہیں جو خاص طور سے ہماری دلچسپی کا باعث ہیں اور جن کی وجہ سے ہم ان پر اوصاف ہستیوں کو زیادہ طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں ایک مثل اس مفہوم کی ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو بہت اچھی طرح جانتے ہوں یعنی ہم اس کی معمولی معمولی باتوں سے بھی بخوبی واقف ہوں تو ہمارے دل میں ضرور اس کے لیے ایک تحقیر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات ایک حد تک صحیح ہوئی ہو مگر اس کے برعکس ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک ہم کسی شخص کو بخوبی نہیں جانتے ہوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں جو ہمایوں نامہ میں پائی جاتی ہیں ہمارے لیے خاص دلچسپی کی ہیں اور ہمارے دل میں ان اشخاص کی جانب جو اس کتاب میں مذکور ہیں ایک قسم کا انس پیدا کر دیتی ہیں مثال کے طور پر بیگم بیگم ہمایوں بادشاہ کو صبح نماز کے لیے بیدار کرنا اور بے محل شکایتوں کا دفتر کھولنا، کھانے پر مرزا سلیمان کی ناشائستہ حرکت مرزا کامران کی سادہ لوحی اور حرم بیگم کے نام خط وغیرہ وغیرہ۔

گلبدن کے ہمایوں نامہ میں ہندوستانی باشندوں اور یہاں کے رسم و رواج کا ذکر نہیں

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ کے آغاز میں اپنے والد بابر فردوس مکانی (بادشاہ بانام) کا ذکر خیر کرتیں ہیں۔ بابر کے دشمنوں کا ذکر بھی کیا ہے تین بار سمرقند کو فتح کرنے کے بعد بابر اپنے آبائی وطن کابل واپس چلے جاتے ہیں۔ گلبدن سلطان ابراہیم اور رانا سانگا کی شکست کو بھی بیان کیا ہے۔ آگرہ کی مختلف عمارات کا بھی ذکر کرتی ہیں، خواجہ کلاں کے ہاتھ بیگمات کو کابل تحالف کا بھیجنا، ہام بیگم کا کابل سے ہندوستان آنا ان کے ساتھ گلبدن بیگم بھی ہندوستان آئی، بابر کے انتقال، ہمایوں کی بیماری، دھول پور اور دیگر مقامات کی سیر یہ سب باتیں تو خود یاد تھیں۔ کچھ لوگوں سے معلوم کر کے گلبدن بیگم نے لکھا ہے نوی طلسم اور مرزا ہندال کی شادی کی تفصیل ہمایوں اور شیرشاہ کی جنگ ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کی شادی ۱۵۴۷ء میں ہمایوں کا سندھ اور ایران کا رخ کرنا گلبدن کا مرزا کامران کے ساتھ کابل واپس جانا، سندھ میں ہمایوں سے بادیہ پیمانی ۱۵۴۷ء میں ایران سے ہمایوں کا واپس آنا اور کابل پر دوبارہ قبضہ کرنا۔ مرزا کامران کی غداری سے مرزا ہندال کا ۱۵۵۱ء میں قتل۔ بھائی کی شہادت صدمہ کا اسے بہت ہی دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔ کامران نے ۲۰ نومبر ۱۵۵۱ء کو ہمایوں کی سپاہ پر شب خون مارا تھا جس میں ہندال مارا گیا۔ گلبدن بیگم لکھی ہے کہ: ”یہ تو بتاؤ کہ میرے شوہر اور بیٹے کو اس شب خون میں کیوں نقصان نہیں پہنچا اور یہ بجلی میرے بھائی پر ہی کیوں پڑی“ کتاب کے آخر میں کامران کی گرفتاری کا ذکر ہے اور یہی تحریر ختم ہو جاتی ہے اور باقی اوراق غائب ہیں۔ گلبدن نے اکبر کے پاس دو مرتبہ جانے کا ذکر کیا ہے ایک بار سلیم سلطان کے ساتھ اکبر سے سلیم کی سفارش کے لیے اور ایک بار حمیدہ بانو بیگم کے ساتھ تحالف کے سلسلے میں۔

گلبدن بیگم بڑی سخی فیاض طبیعت خاتون تھی اس نے بہت سے خستہ حال لوگوں کو خوشحال کر دیا تھا۔ وہ بہت ذہین اور نیک خاتون تھی وہ بڑی حساس اور فرض شناس تھی اور گھر کی معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی۔ گلبدن کی کتاب ہمایوں نامہ اپنی گواہ خود آپ ہے اس کے سوا کسی دوسرے مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

گلبدن بیگم کی یہ بلند حوصلہ اور آزاد بیانی قابلِ صدداد اور ستائش ہے ایسی خواتین خاندان ملک ملت اور قوم کے لیے باعثِ تازش و افتخار ہوتی ہیں انھیں کی بدولت قومیں

تھا جو علمائے ظاہرین کے نزدیک گناہ کر رہا تھا، اس وقت ہندوستان پر اگندہ ہو رہا تھا گلبدن بیگم چوں کہ دین دار تھی اور مذہب کو سیاست سے بہت ہی بالا تر سمجھتی تھی اس لیے وہ دربار کارنگ ڈھنگ دیکھ کر جی ہی جی میں گڑھتی رہتی تھی۔ گلبدن نے اکبر کو بار بار سمجھایا مگر اکبر پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس لیے گلبدن کا رسوخ دربار سے کم ہو گیا۔

سمرقند کی زبان ترکی تھی اور بابر کا زیادہ تر وقت سمرقند میں گزرا اس لیے اس نے اپنی ترک ترکی زبان میں لکھی اور گلبدن کا زیادہ تر وقت کابل میں گزرا جہاں کی زبان فارسی تھی اس لیے گلبدن نے ہمایوں نامہ فارسی زبان میں لکھا اسی وجہ سے ہندوستان میں گلبدن کے ہمایوں نامے کے بعد فارسی زبان کا رواج بڑھتا چلا گیا۔ اور چغتائی زبان ترکی پر فارسی غالب آتی چلی گئی۔ ہندوستان میں بھی فارسی زبان کے رواج کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

بابر بادشاہ اپنے والد کی جانب سے امیر تیمور کے بیٹے میر شاہ کی نسل سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کی نسل سے تھے دونوں طرف سے حسب و نسب اعلیٰ رکھتے تھے اس طرح گلبدن بیگم کی رگوں میں بھی تیموری اور چنگیزی خون شامل تھا۔

گلبدن بیگم کے شوہر خواجہ خضر خاں کے والد امین خواجہ بھی والد کی طرف سے حیدر مرزا دو غلات کی نسل سے تھے جن کا چغتائی اعلیٰ نسب سے تعلق تھا۔ اپنی شادی کا اشارہ گلبدن نے اس طرح کیا ہے کہ جب ہمایوں بادشاہ بنگال کی مہم سے واپس آئے تو گلبدن بیگم کو بچک قصاب پہنے دیکھ کر شادی ہونے کا اندازہ کر لیا۔ کیوں کہ بچک قصاب ایک خاص وضع کا رومال ہوتا ہے جس کو لڑکیاں شادی کے بعد ہی پہن سکتی تھیں وہ اپنے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے بہت حجاب کرتی تھیں اور انھیں اپنے ہاتھ سے خط لکھنا بھی معیوب سمجھتی تھیں مگر اس زمانے کی عورتوں میں بہت سی باتیں روشن خیالی کی تھیں جو آج کی عورتوں میں نہیں۔ اس زمانے میں عورتیں بہت سے فنون میں ماہر ہوتی تھیں سیر و سفر، شہسواری، تیراندازی، غلیل چلانا، چوگان سازی وغیرہ۔ میں مردوں کی طرح مہارت رکھتی تھیں۔ پردہ کا رواج مغلوں میں ہندوستان آنے کے بعد نچتے ہوا۔ سمرقند اور کابل میں پردہ کا رواج کم تھا۔

ملتا ہے اور نہ گلبدن بیگم نے ان کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر کی ہے کیونکہ ہمایوں نامہ صرف ہمایوں بادشاہ اس کے متعلقین اور رفقاء تک محدود ہے اور دیگر یہاں کی باتوں کا کوئی تعلق بھی نہیں دکھائی دیتا پھر بھی گلبدن نے ہماری ہندی زبان کے الفاظ کئی جگہ استعمال کیے ہیں جیسے چھپر کھٹ، (چھپر کھٹ پاتر (تیریا) گنواران (گنوار) وغیرہ وغیرہ۔

گلبدن بیگم کو قدرت نے حسن سیرت کے ساتھ حسین صورت بھی بخشی تھی۔ اپنے زمانے کی عورتوں میں سب سے زیادہ ذہانت علمیت و کاوت رکھتی تھیں ماہم بیگم اور بابر بادشاہ اور سب بھائی بہن گلبدن بیگم کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور سب بے حد لاد پیار کرتے تھے وہ بچپن سے ہی بڑی ہونہار تھی۔ بیمار داری میں گلبدن خاص ملکہ رکھتی تھی۔ مرزا کامران نے اپنی بیماری کے وقت گلبدن بیگم کو سی اپنے ہمراہ رکھا، وہ ہمایوں کی طرفدار تھی، جبکہ ہندال اس کا سگا بھائی ایک بار جب مرزا کامران سے ناراض ہو کر بیگمات کو قید کیا تو گلبدن بیگم کو قید نہیں کیا گیا۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں سے۔ تیموری شہزادوں اور بیگمات کے بارے تعارف کرایا ہے۔ بیگمات کا ہمایوں سے گلبدن بیگم کے متفرق اشعار کے ساتھ اس کی فن شاعری کا پتہ چلتا ہے۔

گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ چنگیزی قانون بہادری اور قابلیت پر تھا نہ کہ عمر میں چھوٹے بڑے ہونے پر چنگیزی قانون فوقیت پر منحصر تھا اس قانون کا اثر مغل شہزادوں پر دکھائی دیتا ہے کیوں کہ تیموری اور چنگیزی خون کا رشتہ مغلوں میں شامل تھا۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ پرانے لوگ اپنی عمر کے اول وقت کی باتیں زیادہ یاد رکھتے ہیں اور موجودہ واقعات کو بھولتے رہتے ہیں۔

گلبدن کے ہمایوں نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے اول وقت کی زیادہ تر گلبدن نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر بیان کی ہیں اور باقی باتوں کو دوسروں سے معلوم کر کے یا سن کر تحریر کیا ہے۔

اکبر پر شیخ مبارک کا بہت اثر تھا وہ اس وجہ سے ایسے ایسے افعال کا ارتکاب کر رہا

ہنستی ہیں انھیں کے ذریعہ مذہب و ملت کا نام روشن ہوتا ہے انھیں کی بدولت۔ بخت
 خوابیدہ جاگ اٹھتے ہیں اور اوبار و نکہت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور شجر امید بار اور ہوتا ہے۔
 حمیدہ بانو بیگم کا جواب کہ ”میں تو اس کے ساتھ شادی کروں گی جس سے ہم سہری ہو سکے۔
 اور جس کے گریباں تک میرا ہاتھ پہنچ سکے کہاں بادشاہ جم جاہ اور کہاں غریب بیکس لڑکی۔ حمیدہ بانو
 بیگم کا یہ جواب پردہ و رجاعت کے حق میں تا زیادہ عبرت ثابت ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس نے طرز عمل سے
 ثابت کر دیا کہ اسلامی احکام کے مقابلہ میں بادشاہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس روشنی اور ترقی کے
 زمانے میں جبکہ تمام ممالک تعلیم مغرب اور تمدن نو کے نور سے منور ہو رہا ہے۔ یہ بات نہایت حیرت
 انگیز معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے میں بھی عورتوں کو شادی بیاہ کے معاملے میں مکمل آزادی تھی۔
 آخری وقت جب حمیدہ بیگم نے کہا جیو (بڑی بہن) میری عزیز از جان جیو قربانت شوم۔
 ذرا آنکھ کھولو بیگم نے آنکھ کھولیں اور مغنوم عزیزوں کا جھرمٹ اپنے گرد پا کر رونے لگیں اور دھیمی آواز
 میں کہا اچھا خدا حافظ میں جاتی ہوں تم زندہ رہو، اکبر نے گلبدن بیگم کی میت کو کندھا دیا۔
 فروری ۱۶۶۷ء میں بمقام آگرہ میں اس جہاں فانی سے جدا ہو گئیں۔ اس وقت آپ کی
 عمر ۸۰ سال کی تھی۔ اکبر قبرستان تک میت کے ساتھ گیا اور اس وقت گلبدن بیگم کا خرقہ موجود نہیں
 تھا اس لیے اکبر نے میت کو قبر میں اتارا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

گل رُخ بیگم

گل بدن بیگم جو کہ بابر کی بیٹی اور گل رُخ کی بڑی ہمیشہ تھی اپنی تصنیف ”ہمایوں نامہ“ میں اس عہد کے تمدنی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا۔ ہے ہمایوں نامہ میں گل بدن بیگم نے شاہی خاندان کی شہزادیوں اور بیگمات کے حالات کو بھی بڑے سلیقہ سے قلمبند کیا ہے۔

مولانا شبلی نے ہمایوں نامہ کی خصوصیات کو اپنے ریویو میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور ہر بات کو صاف طور سے بیان کیا ہے کہ تیموری شہنشاہوں نے شہزادوں کے ساتھ شہزادیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ یہ ہی ان کی علم دوستی اور حسن مذاق کا نمایاں ثبوت ہے۔

گل رُخ بیگم ایک اعلیٰ ادیب، اعلیٰ شاعر، اعلیٰ انشا پرداز تھی بابر کی بیٹی اور گل بدن بیگم کی ہمیشہ تھی۔ گل رُخ بیگم کی ولادت صالحہ سلطان بیگم کے بطن سے ہوئی بابر کی یہ بیٹی بھی علم و ادب اور شعر و شاعری میں بے حد ذوق و شوق رکھتی تھی۔

اپنی معروف تصنیف ”صبح گلشن میں نواب حسن خاں گل رُخ بیگم کا مندرجہ ذیل ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

”یہ گل رُخی روئی و سلیقہ شاعری سرآمد زمرہ نسواں غنچہ دہانش بہیم اشعار لطیف می شکفت۔ صبح گلشن، ریاض الشعراء، مخزن الغرائب میں، گل رُخ بیگم کا مندرجہ ذیل شعر منسوب تحریر ہے۔

ہیچ کہ آں شوخ گل رخسار بے اغیار نیست
راست بود دست آنکہ در عالم گل بے خار نیست

مغلوں کے ابتدائی دور میں جو سلطنت اور تہذیب و تمدن کا آغاز تھا ایسے وقت میں گل بدن بیگم، گل رُخ بیگم اور دیگر بیگمات کے علم و ادب کے ذوق کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

اور معلوم ہوتا ہے تیموری شہزادیاں ————— علم کے میدان میں شہزادوں سے کچھ نہیں
تھیں۔ انھیں بیگمات نے شریفانہ مسلم تہذیب و تمدن کی نگہبانی بھی کی اور لطیف زبان کے
ذریعہ ادبی ذوق کو بھی پورا کیا۔ انھیں بیگمات نے ہندوستانی نسوانی زندگی میں ایک عظیم
انقلاب پیدا کر کے اسے قابل رشک بنا دیا ہے۔

گل رُخ بیگم حسین و جمیل شہزادی کھتی نیک سیرت خاموش طبیعت خاتون کھتی مطالعہ
کا بے حد شوق تھا بابا برائے بہت پیار کرتا تھا۔

اس حسن پری شہزادی کو اللہ نے اوصاف حمیدہ عطا کیے تھے شعروادب میں بے پناہ ذوق
رکھتی تھیں شاعری کا شوق تو تمام مغل شہزادیوں اور بیگمات کو ورثہ میں ملا تھا۔ شاہی حرم کے
علمی و عملی ماحول نے بیگمات کو اہل قلم بنا دیا تھا۔

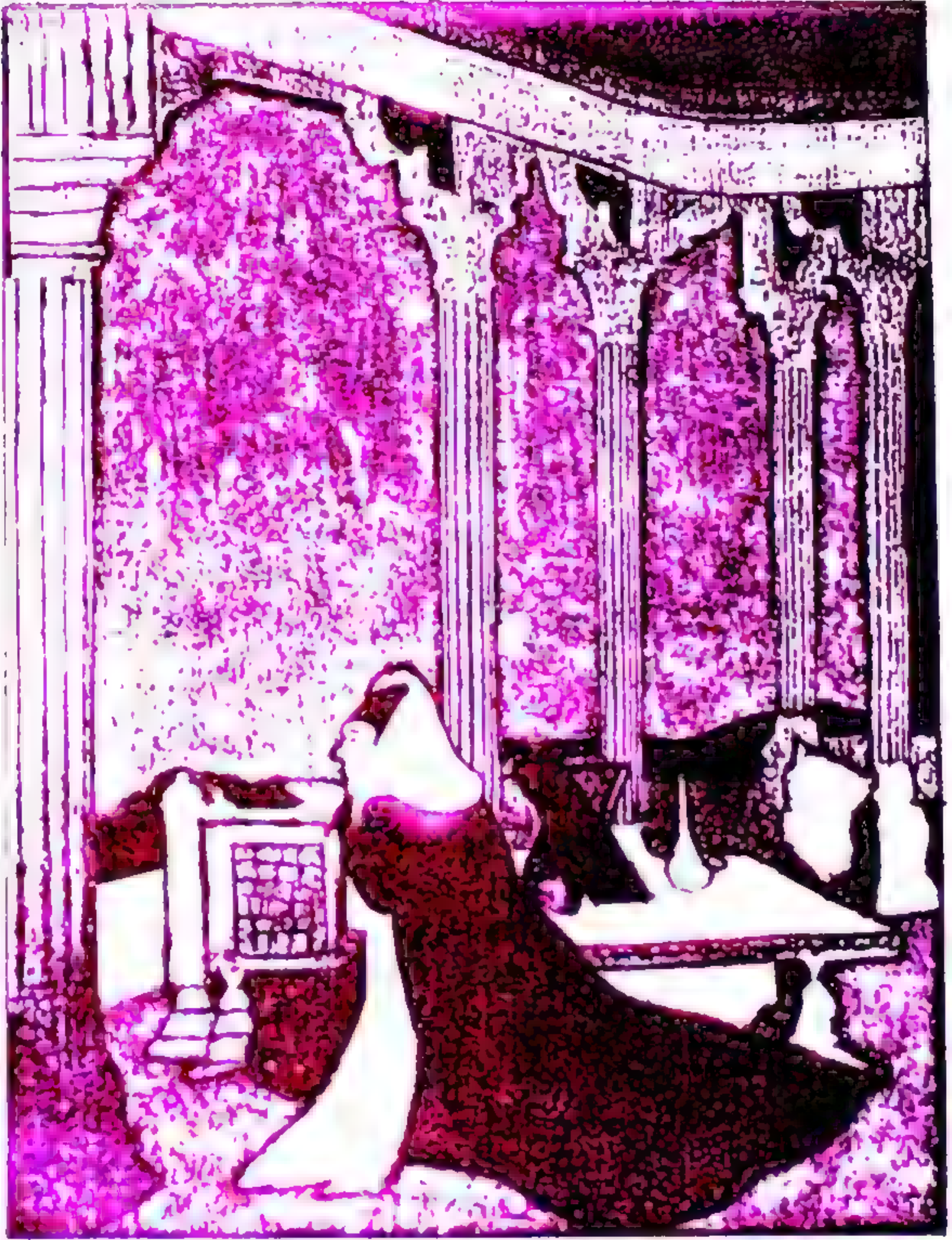
جہاں آرا بیگم

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی دوسری چہتی بیٹی تھی حور النساء جہاں آرا بیگم کی بڑی ہم شیر تھی جس کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جہاں آرا بیگم ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ مطابق یکم اپریل ۱۶۱۴ء کو بدھ کے دن ارجمند بانو بیگم کے لطن سے پیدا ہوئی یہ تاریخ پیدائش بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۲۹۱ اور عمل صالح حصہ اول صفحہ ۸۰ منتخب الباب جلد اول صفحہ ۲۷۸ میں درج ہے مگر ڈاکٹر چارلس ریو ۱۲ کی فہرست مخططات فارسی درموزہ برطانوی میں جہاں آرا بیگم کی ولادت کی تاریخ ۱۰۲۲ھ قرار دیا ہے مگر یہ تاریخ غلط ہے اور ۱۰۲۳ھ تاریخ پیدائش صحیح ہے۔

جہاں آرا بیگم نے شاہجہانی عہد کے اعلیٰ علمی فضا کے گہوارہ میں پرورش پائی اور شہزادی کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ سنی النساء جو قرآن حافظ اور علم طب، علم قرأت، تجوید اور ادب شناسی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی سنی النساء، خانم حکیم رکن کاشی کے بھائی نصیر کاشی کی بیوی تھی اور خانم کے بھائی ملک الشعراء طالب عائلی تھے سنی النساء، خانم ممتاز محل کی مہر دار بھی تھی، شہزادی جہاں آرا بیگم کی تعلیم و تربیت کا کام سنی النساء، خانم کو سپرد کیا گیا۔ خانم کا روضہ تاج گنج اگرہ میں شاہجہاں نے خود اپنے خرچہ سے تعمیر کرایا۔ مآثر الکرام کا بیان ہے کہ خانم نے شہزادی کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ شاہجہاں عہد کا معروف سیاح بیوانیر رقمطراز ہے کہ :

”اس میں شک نہیں کہ جہاں آرا بیگم ایسی خاتون ہے جس میں تمام اوصاف اور خوبیاں پائی جاتی ہیں یہ وہ خاتون ہے کہ اگر تمام دنیا کی سلطنت اس کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ نہایت عمدگی کے ساتھ اس پر حکومت کر سکتی ہے“
مسٹر ڈبلویل لکھتے ہیں کہ :

۱۔ بحوالہ جہاں آرا بیگم از محبوب الرحمن کلیم



جہاں آ، ابیکم سادہ جہاں نرود

”جہاں آرا بیگم عورتوں کی تاریخی دنیا میں بلحاظ عصمت و جہا کی بے مثل شہزادی گزری ہے اور تمام کتب تاریخ اور ملکی راگوں میں ایک نامور خوش اخلاق فاضل اور خوبصورت بیگم مشہور ہے۔ جہاں آرا کا نام ہمیشہ صفحات تاریخ کو آراستہ رکھے گا اور قیامت تک اطاعت والدین اور ادائے فرض منصبی میں ضرب المثل رہے گی۔“

شاہ جہاں اور ممتاز محل جہاں آرا کی بڑی قدر دانی کرتے تھے شہزادی اپنے عہد کی ایک معروف شاعرہ اور مصنفہ تھی۔ جہاں آرا نے ۲۶ سال کی عمر میں ”مونس الارواح“ لکھی اس معروف تصنیف میں شہزادی نے خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلے کے اکابرین کے حالات بہت ہی عقیدت مندی، ہوشیاری اور بڑے احتیاط سے قلمبند کیے ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب شہزادی کی مذہبی اور صوفیانہ ذوق کی صحیح آئینہ دار ہے۔ بیگم نے کتاب میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ :

”احوالِ بزرگاں را کہ مقربان در گاہ صمدیت انداز کتب و رسائل معتبرہ با احتیاط تمام پیروں آوردہ بقید تحریر آوردہ شد و اعتقاد این ضعیفہ انچہ دریں رسالہ بنت گردیدہ صحت نام دار و امید کہ خوانندگان را فیض و بہرہ مانجام از حاصل آید۔“

کتاب کے مطالعہ سے بیگم کی طرزِ تحریر اور بزرگانِ دین سے عقیدت کا علم ہوتا ہے حقیقت میں بیگم بزرگانِ دین کا بے پناہ ادب و احترام کرتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم مونس الارواح کی طرزِ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کتاب کی عبارت بہت صاف اور شستہ ہے یہ مصنفہ کی طرزِ انشا کی خوبی ہے جو قابلِ تعریف ہے، اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں ہے جس کو بیگم نے عاقل غلام (مشہور خوشنویس) سے لکھوایا تھا اور تمام کتاب طلائی نقش و نگار اور زریں افشاں سے مزین کرایا تھا۔ نسخہ بیگم کی عمر کے ۴۶ ویں سال میں لکھوایا تھا۔ پوری کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۔ بحوالہ جہاں آرا بیگم از محبوب الرحمن کلیم ص ۲۶

مولانا شبلی مہرچوم نے اس کتاب کو بڑی رقم میں خریدا تھا۔ اس کتاب میں خطاطی کے اعلیٰ نمونے بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب پیرس کی نمائش ۱۹۱۱ء میں بھیجا جا چکی ہے۔

جہاں آرا نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذکر کی ابتدا مندرجہ ذیل اشعار سے کی ہے:

”اے شہنشاہ جہان معرفت

ذات ادبیروں زادِ ادراک و صفت

حس و ملک فنا بے تخت و تاج

از خود بحر از غیر خود بے احتیاج

غرق بحر عشق از صدق و صفا

از خودی بیگانہ با حق آشنا

کرد مرغ ہمتش ز اوج کمال

بیضہ افلاک را در زیر بال

اختر برج سپہرلم یزل

گوہر درج کمال بے بدل

اے معین دین و ملت بے نظیر

قانع از دنیا بملک دین امیر

در ثنائے اور زبانم راجہ حد

فیض او باید کہ فرماید مدد“

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر پہنچ کر بیگم اس طرح عقیدت مندی کا اظہار کرتی ہے:

”میں گوید فقیر و حقیرہ جہاں آرا اے چوں از یادِ نجات و فیروز می طالع

از دارِ خلافت اکبر آباد در خدمت والدِ بزرگ وار متوجہ خطہ پاک حضرت اجمیر

بے نظیر شدم از تاریخ ہزارہم ماہ شعبان المعظم سنہ یک ہزار و پینچا ہ سنہ ہجری

...عجب شامی دیدم آنجا کہ بہتر از صبح بود اگرچہ اخلاص و محبت ایں فانیان تقاضائے

اُس نمی کرد کہ بایں قسم جائے متبرک پر فیض گوشہ عافیت رفتہ باریخانہ بسیاد
اماچہ چارہ ۷

رشتہ گردنم انگندہ دوست

می بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اگر احتیاری داشتہ ہمیشہ در روضہ حضرت کہ عجب گوشہ عافیت است و من
عاشق گوشہ عافیت بستم ببری بردم و با سعادت طواف نیز مشرف می شدم
ناچار چشم گریاں و دل بربیاں بصد ہزار افسوس از اں در گاہ رخصت
شدہ بخانہ آدم و تمام شب طرفہ بقراری در من بود۔

یہ عبارت ۱۰۵۳ھ میں بطور ضمیمہ لکھی گئی۔ صوفیائے کرام سے عقیدت کا یہ عالم ہو گیا کہ شہزادی
جہاں آرا کا زیادہ تر وقت ان کے حالات کے مطالعہ میں ہی گزرنے لگا۔ مونس الارواح میں
خود تحریر کرتی ہیں کہ :

... " ایں ضعیفہ را چہ از ادائے فرض و واجبات و تلاوت قرآن مجید پیچ امرے
شریف تر از ذکر حالات و مقالات اولیا کرام قدس اللہ از دہم نمی داند
بنا براں خلاصہ اوقات خود را بمطالعہ کتب و رسائے کشتل براحوال
سعادت مال بزگان دین و اکابر صاحب یقین ست صرف می نماید "

۱۹۱۳ء میں انگریزی خاتون نے جہاں آرا کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کے دیباچے
میں خاتون تحریر کرتی ہے کہ :۔۔۔

... جب وہ آگرہ کے قلعہ کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ ثمن برج کے ایک پتھر
کے نیچے سے کچھ مسودے ملے، مسودے کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ جہاں آرا کی
خودنوشتہ تحریریں ہیں جن کو جہاں آرا نے شاہجہاں کے ساتھ قید تھی اسی لیے
اس نے قید کے زمانے میں اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات لکھنے شروع
کیے اور ان کو ثمن برج کے نیچے چھپا دیا، جب پتھر خستہ ہو جانے کا تو یہ تحریر

لوگوں کے ہاتھ آئے گی جن سے ان کے اصلی خیالات و جذبات و حالات روشن ہوں گے۔

تحریر میں روانی اور تمثیلی رنگ بہت غالب ہے اور اسلوب بیان بہت ہی دلکش اور مؤثر ہے۔
بقول سید صباح الدین کہ :

... میں نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اس کو سرا سر جلی اور نقلی پایا یہ محض ایک نئے اور دل نشین انداز میں جہاں آرا بیگم کے اخلاق اور کردار کو مسخ کر کے دکھانے اور عالمگیر کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش میں لکھی گئی ہے۔ کتاب میں بعض لغو اور لاطائل واقعات پیش کیے گئے ہیں۔۔۔ مثلاً جہاں آرا راجپوتوں کی مدح ہے وہ ایک راجپوت سردار پر عاشق ہو گئی وہ شادی اس لیے نہیں کر سکتی کہ اکبر نے قانون بنا رکھا تھا کہ مغل بادشاہوں کی لڑکیاں رشتہ ازدواج سے محروم ہیں چنانچہ جہاں آرا چھپ چھپ کر اپنے محبوب راجپوت سے ملتی ہے۔ عشق و محبت کی باتیں کرتی ہے اور اپنی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کو تحفے دیتی ہے جب دارا اور نگ زیب میں خانہ جنگی شروع ہوتی ہے تو جہاں آرا کی محبت اور عشق میں راجپوت سردار دارا کی حمایت میں اور نگ زیب کے خلاف لڑتا ہے راجپوت جہاں آرا کے ایک دوسرے عاشق کے ہاتھوں مارا جاتا ہے مگر اس کا ایک ہار جہاں آرا کے ہاتھ لگ گیا جس کو وہ قیمتی یادگار سمجھ کر اپنے پاس رکھتی ہے۔“

اس کتاب میں اسی طرح کی اور بھی خرافات ہیں۔۔۔ جو محض اورنگ زیب اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی گزشتہ تاریخ کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں برنیر، منوچی، اسمتھ وغیرہ جیسے متعصب اور یورپین مورخین نے جہاں آرا کی ذات کے ساتھ بہت ہی نازیبا حکایتیں منسوب کر دی تھیں لیکن سنجیدہ مورخوں نے حقائق کی روشنی میں ان کی تردید کر دی ہے۔ (بزم تیمورہ)

جہاں آرا کے سوانح نگار نے اس کی تالیفات میں ایک سیاحت نامہ اور ایک مثنوی بھی بتائی ہے مگر ان کا ذکر کسی مستند تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔ جہاں آرا بیگم کے حمدیہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۷

”آنجا کہ کمال کبریائے تو بود
عالم نمی از بحر عطا ہے تو بود
مارا چہ حمد و ثنائے تو بود
ہم حمد و ثنائے تو سرکے تو بود“

منشی سنیل چند تاریخ اگرہ کے مصنف نے چند مرثیہ کے اشعار جو جہاں آرا نے اپنے باپ کی وفات کے موقع پر کہے تھے ملاحظہ ہوں۔ ۷

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر
آیا شب فراق ترا ہم بوسحر
اے بادشاہ عالم و قبد جہاں
بکشائے چشم رحمت و بر حال من نگر
نالم چنیں ز غصہ و بام بود بدست
سوزم چوں شمع در غم و دورم رود زمر

کلمات الشعراء، ریاض الشعراء اور خزانہ عامرہ میں جہاں آرا بیگم کے ذوق شاعری کا پتہ چلتا ہے، ایک دفعہ جہاں آرا باغ کی سیر کو نکلی وہاں برقع میں صدی طہرانی چھپ کے یہ تماشا دیکھنے لگا جب بیگم کا ہاتھی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے بے ساختہ مندرجہ ذیل مطلع پڑھا

۷ برقع برخ افگندہ بردنا ز بیا غش
تا نکہت گل بیخہ آید بہ دما غش

جہاں آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ جب شاعر کو جہاں آرا کے سامنے آیا تو بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے بطور انعام دیے مگر ساتھ ہی حکم دیا کہ

اس کو شہر سے نکال دیا جائے کیوں کہ جہاں آرا کو شعر تو پسند آیا لیکن اس کی گستاخی پسند نہیں آئی۔

مولانا شبلی مرحوم — اپنے مقالے (زیب النساء) میں تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لیے کس قسم کے
 ادب مقرر تھے“

جہاں آرا کی علمی فیاضی کی ایک اور مثال مرزا حسن بیگ رفیع کی مثنوی کی ہے جو اس نے
 شاہجہاں آباد کے باغِ حیات بخش کی تعریف میں لکھی تھی اور اس کو حکمت الشعراء میں درج کیا ہے
 مثنوی کے اشعار جہاں آرا کو بے حد پسند آئے اس کے صلہ میں بیگم نے شاعر کو پانچ سو روپے
 بطور انعام بھیجوائے۔

مولانا غلام علی آزاد تحریر کرتے ہیں کہ :

”مرزا محمد علی ماہر نے جہاں آرا کی مدح میں ایک مثنوی لکھ کر ان کی
 خدمت میں پیش کیا، بیگم نے ماہر کو پانچ سو روپے بطور انعام دیے“
 مثنوی کے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو :

بذات تو صفات کردگار است
 کہ خود پنہاں و فیش آشکار است

مگر مولانا غلام علی آزاد اس روایت کو صفحہ نمبر ۱۱۴ نقل کرتے ہیں کہ ”یہ شعر نعمت خاں عالی کی مثنوی
 میں بھی ملتا ہے جو اس نے زیب النساء کی خرگاہ پر لکھی تھی“ تذکرۂ مخزن الغرائب میں یہ تحریر ہے
 کہ مرزا محمد علی ماہر نے نو سو اشعار کی ایک مثنوی زیب النساء کی شان میں لکھی جس میں مذکورہ بالا
 شعر زیب النساء کو بہت پسند آیا ہے

قدسی کو ایک قصیدہ پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔ قصیدہ کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو :

لہ بحوالہ بزم تیموریہ حصہ سوم

تاسرزدہ از شمع چنیں بے ادبی
پروانہ ز عشق شمع را سوختہ است

جس وقت یہ قدسی نقاب شہزادی عالم وجود میں آئی اُس وقت خرم جہنوز کے رانا سے برسرِ پیکار تھا۔ خرم کی فتح ہوئی تو منصب میں اضافہ ہوا، قدیم رسم کے مطابق دادا جہانگیر نے بچی کا نام جہاں آرا رکھا، جہاں آرا سے پہلی لڑکی حور النساء کا انتقال ہو چکا تھا۔ جہاں آرا کی پرورش حوری جان کے سپرد کی گئی، حوری جان کی وفات کے بعد سستی النساء خانم نے جہاں آرا بیگم کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی۔

جہاں آرا بیگم کی پیدائش کے وقت تیموری حرم دنیا کی قابل ترین خواتین سے بھرا پڑا تھا حرم کے ماحول کے اثر سے جہاں آرا نے زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت حاصل کر لی۔

جب شاہجہاں ۱۴ فروری ۱۶۲۵ء کو سربراہ ہند ہوا تو جہاں آرا کی عمر ۱۵ سال کی تھی ممتاز محل کی وفات کے بعد ممتاز محل کی نصف جائداد جہاں آرا کو عطا کی گئی اور محل کے تمام امور اور مہرداری وغیرہ سب ذمہ داری جہاں آرا کے سپرد کی گئی۔

مولانا محمد علم الدین سالک اپنی معروف تصنیف دختران ہند میں تحریر کرتے ہیں کہ :

”اب جہاں آرا کا اقتدار اور جاہ و جلال تمام منزلیں طے کر کے معراج
کماں تک پہنچ گیا اب اس کا ہر شعبہ میں رسوخ ہر صیفے میں اثر امراء
ذی وقار اور شاہزادگان والا تبار اس کے آستانہ دولت پر سربِ نیاز خم
کرنا باعثِ فخر و مباہات سمجھتے تھے“

قیام لاہور ۱۶۴۲ء میں ایک دفعہ جہاں آرا کے کپڑوں میں آگ لگنے سے جل گئی سلطنت کے معروف حکیموں اور جراحوں نے علاج کیا بادشاہ کو بیگم کے جل جانے کا بہت افسوس ہوا تمام بہنیں بھائی بیگم کی تیمارداری کے لیے فکر مند تھے عارف جراح کے علاج سے جب بیگم

ٹھیک ہوگئی تو باپ کے ساتھ اجمیر جاتے ہوئے زخم پھٹ گئے۔ اب حصار کے فقیر بامون نے بیگم صاحبہ کا مکمل علاج کیا مگر دورِ حاضر کے مورخین کی رائے ہے کہ بیگم کا علاج کیبریل باٹن نے کیا تھا۔ اسی خوشی میں شاہجہاں نے اسے تجارت کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ کیبریل باٹن ۱۶۴۵ء میں نام زد ہوا جبکہ بیگم کے جلنے کا واقع ایک سال بعد کا ہے دوسرے یہ کہ اگر کیبریل باٹن بیگم کا علاج کرتا تو ضرور ہندوستان میں اس کی کوئی یادگار ہوتی۔ یہ جدید مورخین کی رائے بالکل غلط ہے اور فقیر بامون نے آخر میں بیگم کا علاج کیا اور فقیر کو بادشاہ نے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔

۱۰۵۶ء میں جب نظر محمد والی بلخ کی بہو بیٹیوں اور دیگر رشتہ دار بیگمات کو قیدی بنا کر دار الخلافہ لائے تو ان بیگمات کی نگہداشت اور مہمان نوازی کے فرائض جہاں آرا ہی نے ادا کیے۔ دورِ دراز کے امراء بادشاہ کی آستان بوسی کے بعد جہاں آرا کی درگاہ پر حاضری دینے آتے تھے۔

منتخب اللباب کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ ۱۰۶۰ء میں جب محمد صفی بن اسلام خاں دربارِ معلیٰ میں حاضر ہوا تو اس نے ۵ لاکھ روپیہ اور جنس جہاں آرا کی خدمت بطور نذرانہ پیش کیا۔ خانہ جنگی میں بیگم دارا کی حامی تھی اور نظر بندی کے وقت چھپتی بیٹی، جہاں آرا نے اپنے باپ کی خاطر خدمت اور ہمدردی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

یہ بات بھی صحیح ہے کہ دورِ اندیش عقلمند دانشور رحم دل جہاں آرا نے عالمگیر اور شاہجہاں اور دیگر بھائیوں سے صلح کرانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی یہ بات بالکل غلط ہے کہ جہاں آرا اور عالمگیر کی بول چال تک ختم ہوگئی تھی غور مائیں۔ جب عالمگیر نے ایک لمبی خوفناک بیماری کے بعد غسلِ صحت کیا تو جہاں آرا بیگم نے عالمگیر کا جشنِ صحت منایا اور اس وقت عالمگیر

۱۰ بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۵۸۰

۱۱ منتخب اللباب صفحہ ۷۰۵

جہاں آرا کو گراں بہا قوم بطور انعام عطا کرتا ہے۔ عالمگیر اور شاہجہاں کے درمیان صلح کر کے بیگم نے جو قیمتی جواہرات بھی عالمگیر کو دلائے۔

”ایک طرف جہاں آرا بیگم بوڑھے باپ کا سہارا تھی تو دوسری طرف اپنے جواں بخت بھائی کی ترجمان تھی۔۔۔ اگر جہاں آرا کا دم نہ ہوتا تو باپ اور بیٹے میں نہ تو کبھی صلح ہوتی اور نہ ہی ہندوستان کا تخت و تاج سیاسی سازشوں کی مہمراں گیزیوں سے محفوظ رہتا۔“
۲۶ رجب ۱۰۲۸ھ کو جب شاہجہاں داعی اجل کو لبیک کہتا ہوا آشیانہٴ خلد میں نشیمن نشیں ہو گیا تو یہ دنیا جہاں آرا کے لیے تاریک ہو گئی۔ اس وقت عالم گیر اور بیگم صاحبہ میں خط و کتابت ہوئی اس کا حرفِ حرف تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے، اس نے آخر تک خانوادہٴ تیموریہ کی کشیدگیوں کا قلع قمع کرنے اور بھائیوں کی نا اتفاقی ختم کرنے کی کوشش کی اسی لیے بیگم نے عالمگیر کے بیٹے اعظم کی شادی داراشکوہ کی دختر زیب بانو سے کرائی زیب بانو کو جہاں آرا نے ہی پالا تھا شادی بھی زیب بانو کی بیگم نے ہی کی تھی، عالمگیر خود بارات لے کر جہاں آرا کے محل پر آیا تھا۔“

شاہجہاں کی وفات کے ۱۶ سال بعد بیگم کا انتقال ہوا۔ عالمگیر اس وقت اجمیر تھا۔ تین دن تک بیگم کی موت کا غم منایا گیا۔ بیگم نے اپنا مزار حیات ہی میں تیار کرایا تھا اور اس کے لیے کتبہ بھی خود ہی تجویز کیا تھا جو اس کے لوحِ مزار کا کام دیتا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ اس مزار کا کھڑا تو سنگِ مرمر کا ہے لیکن تعویذ بالکل خام ہے جو ہمیشہ سبزہ سے ڈھکا رہتا ہے۔

جہاں آرا اپنی خواہش کے مطابق خواجہ نظام الدین اولیا کے مزارِ انوار پر ٹھیک بائیں میں دفن ہوئیں اس کی نیکی، انکساری، پرہیزگاری اور ذوقِ شاعری اس کے سبب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے جو اس کی تحریرِ مکتوب ہے:

۱۔ دخترانِ ہند۔ ۲۔ مآثرِ عالمگیری صفحہ ۸، ۹، ۱۰،

تعبیر سبزہ نہ پوشید کے مزار
کہ قبر پوشش غریباں ہمیں گیا بس امت

”الفقرۃ الفانیہ جہاں آرامرید خواجگان چست بنت - شاہجہاں پادشاہ
غازی انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ“

جہاں آرا بیگم صحیح معنوں میں فقیرہ تھی وہ نہایت سخی کریم النفس اور باذل تھی وہ علوم و متد
اولہ میں ماہر اور فنون لطیفہ سے پوری طرح واقف تھی اس کی سب سے بڑی خوبی حسن اخلاق
کردار کی پاکیزگی اور عادت کی سنجیدہ تھی ہزار ہا بلیکس و مفلس و لاچار معذور بیوہ لڑکیوں کی امداد
کرتی تھی۔

مولانا محمد علم الدین سالک اپنی مشہور تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ :
”تیموریوں کا حرم جن بلند مرتبہ اور اوالعزم ہستیوں پر ناز کرتا ہے
ان میں جہاں آرا بیگم خاص امتیاز رکھتی ہے اس قدسی منش اور کریم النفس
خاتون نے قرون وسطیٰ کی تحریک نسوانی میں وہ انقلاب پیدا کیے ہیں کہ
اس کا نام آسمان شہرت پر مہر و مہن کر چمک رہا ہے، اس عفت
سرشت بلند اقبال بیگم کی بدولت طرز معاشرت میں خاص خاص نزاکتیں
اور لطافتیں پیدا ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے نام کی غلغلہ انداز
صداؤں سے ہندوستانی تمدن و معاشرت کے در و دیوار آج تک
گوںج رہے ہیں۔“

جہاں آرا بیگم کی شان و شوکت کے بارے میں منوجی بیگم سواری نکلنے کا نقشہ پیش کرتا ہے :
”جس وقت بیگم صاحبہ کی سواری محل سے دربار کو چلتی ہے تو بڑی شان
و شوکت سے اور بہت سے سوار پیادے اور خواجہ سرائے جلو لیے چلتے ہیں

خواجہ سرائے جو اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں جس کسی کو سامنے دیکھتے ہیں ڈھکیل کر ایک طرف کر دیتے ہیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ چلتے ہوئے ہٹو بچو کا نعرہ بلند کرتے جاتے ہیں تمام شہزادیاں اسی طرح کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جو شخص انہیں آتا دیکھتا ہے فوراً رستہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہو جاتا ہے۔ ان کی سواری بڑی آہستہ آہستہ چلتی ہے آگے آگے ہمیشہ سڑک پر پانی چھڑکتے جاتے ہیں تاکہ گرد نہ اڑے شہزادیاں ایک پالکی میں سوار ہوتی ہیں جس کے اوپر ایک بڑا قیمتی کپڑا یا سنہری جالی ہوتی ہے جس میں اکثر اوقات قیمتی پتھر اور جواہرات لگے ہوتے ہیں۔ پالکی کے گرد خواجہ سرائے مورے کے پردوں کے پنکھوں سے مکھیاں اڑاتے جاتے ہیں ان پنکھوں کے دستے جواہرات سے مرصع ہوتے ہیں اور اوپر سنہرا کام ہوتا ہے نوکر سنہری یارو پہلی ڈنڈے ہاتھوں میں لیے ہوئے "ہٹو بچو" پکارتے ہیں پالکی کے ساتھ ساتھ انواع و اقسام کی خوشبوئیاں بھی ہوتی ہیں۔" لے

شاہجہاں ۱۱ اپریل ۱۶۵۸ء کو اطلباء کے مشورے سے بلوچپور پہنچے اس وقت بادشاہ کی علالت نے صحت کمزور کر دی تھی دھرمات کی شکست کی خبر بھی بادشاہ کو مل چکی تھی۔ داراشکوہ نے باپ سے آگرہ واپس آنے کا اصرار کیا تاکہ باغی شہزادوں کے مقابلے کے لیے ایک نئی طاقتور فوج تیار کی جائے اسی درمیان کچھ اور کمزور کو کششیں مصالحت کے لیے کی گئیں جہاں آرانے یقین دلانے کے لیے اورنگ زیب کو خط لکھا کہ "دراصل سلطنت کے سارے معاملات شہنشاہ کے قبضہ قدرت میں ہیں نیز یہ کہ ویکز نماز کے اوقات سارا وقت رعایا کے فلاح و بہبود کی دیکھ بھال اور مذہب کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ اس نے اس کی غیر محتاط

بے باکی سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ہر اصول عقلی اور دوراندیشی کے خلاف ہے کہ عمر میں سب سے بڑے شہزادے سے جنگ کی جائے تم کو راہ وفادار و فرما برداری پر قدم رکھنا چاہیے بہتر ہے کہ اسی مقام پر رک جاؤ جہاں پہنچ گئے ہو، دونوں طرف مسلمانوں کی جان بچانے کے خیال سے اپنی عرضداشت حضور شاہ پیش کرو۔

صاحب نے بیان کیا ہے کہ جہاں آرا نے یہ خط اپنے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ اورنگ زیب کے پاس بھیجا ہے مگر جہاں آرا کا یہ مشورہ قابل سماعت نہ ہوا، شہنشاہ نے بھی اسی مفہوم کا اورنگ زیب کو خط لکھا جس میں راہ سے الگ ہونے کی تاکید کی جو اورنگ زیب نے اختیار کر لی تھی، لیکن اورنگ زیب نے ساری غلطیاں داراشکوہ کی بتائیں ایک بار پھر دوبارہ باپ بیٹے میں خط و کتابت ہوئی مگر بے سود۔

ایک بار جہاں آرا خود اورنگ زیب کے پاس باپ کا پیغام لے کر پہنچیں جہاں آرا نے بتایا کہ ”شہنشاہ تم کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتے ہیں اور دارا کو پنجاب و مغربی سرحدی علاقہ میں مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ دکن معظم کو اور گجرات مراد کو اور بنگال شجاع کو دینے کا خیال ہے۔ لیکن اورنگ زیب نے جواب دیا کہ جب تک وہ پوری طرح دارا سے نہ نیٹ لے گا وہ شہنشاہ کے دیدار کے لیے نہ جائے گا۔ جہاں آرا مایوس ہو کر چلی آئی۔“

جہاں آرا کا سلسلہ نسب نہیاں کی طرف سے مرزا غیاث بیگ تہراتی الملقب بہ اعتماد الدولہ سے ملتا ہے۔ مرزا غیاث الدین قزوینی کی بیوی کا نام دیوانچی بیگم جس کا سلسلہ نسب شیخ بہرہوی سے ملتا ہے جو خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے جہاں آرا اس عفت نصب خاتون کی بیٹی تھی جس کے صدقے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کو تاج جیسی دولت ملی جو بجا طور پر عجوبہ عمارت سمجھی جاتی ہے۔

باغات

۱۔ باغ آگرہ :

شہنشاہ شاہجہاں نے ۸۰ بیگہ زمین پر اپنی بیٹی جہاں آرا کے لیے یہ باغ لگوا یا جو بہت ہی خوبصورت ہے اس باغ میں خوشنما ولایتی پھل اور پھولوں کے درخت لگائے گئے اور باغ میں بہت سی حسین عمارات تعمیرات کرائی گئیں یہ عمارتیں بڑی دلکش تھیں اس باغ کو "انقلاب زمانہ فوٹو" کہا جاتا تھا۔ آج اس باغ کی خستہ حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اس کی سیر عبرت کا سبق دیتی ہے کسی زمانہ میں اس باغ کی روشنیوں پر پیکر بیگمات کی رفعت خرام ناز تھیں آج وہاں جانور گھومنے ہیں اور خار و خاشاک کے سوا کچھ نہیں افسوس جس باغ میں بادشاہ بیگم اور شاہی خاندان کی ماحوش خواتین جلوہ گر ہوتی تھیں ان عمارات پر اب زار و زغن کے آشیانے ہیں۔

۲۔ باغ صفاپور :

یہ باغ دولت سرائے سے سات کوس پر واقع ہے۔ یہ باغ بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا۔ اس باغ میں خوبصورت تالاب، کشتیاں اور چراغاں کا معقول انتظام ہوتا تھا۔

۳۔ باغ صاحب آباد :

اس باغ کی بنیاد جہانگیر نے رکھی، عالمگیر نے بھی اس باغ کی سیر کی، اس باغ میں بہت سی خوبصورت عمارتیں اور ایک حسین چشمہ تعمیر کرایا گیا۔ ان باغات کے علاوہ جہاں آرا بیگم نے بہت باغات لگوائے جن سے اس کی باغبانی سے دلچسپی اور سیر و تفریح کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ باغ نورافشاں :-

یہ باغ شاہجہاں نے بڑی دلچسپی سے کشمیر میں تعمیر کرایا جو دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے یہ باغ بھی بادشاہ نے جہاں آرا کے نام کر دیا تھا۔ یہ باغ اپنی خوبصورتی میں مثال رکھنا تھا ۔

۵۔ باغ ڈل :-

اس باغ کو خواجہ سرا جواہر خاں نے ڈل جھیل پر واقع تعمیر کرایا تھا جسے بعد میں بادشاہ نے اس باغ کو بھی جہاں آرا کے نام کر دیا۔ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ :
”یہ تینوں باغ ” باغ صفاپور “ ” باغ نورافشاں اور باغ ڈل “ جہاں آرا بیگم کی توجہ سے رشک جنت بنے ہوئے تھے، ان کی دلنشیں عمارت اور فردوس منظر و شنیں ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے ہوئے تھیں“

جہاں آرا بیگم کی تعمیرات اور باغات کو دیکھ کر اعزازہ ہوتا ہے کہ اپنے باپ شاہجہاں ہی کی طرح بیگم کو فن تعمیر اور باغبانی کا ذوق شوق اور شعور تھا۔ اس کی دلچسپی اس کے ذوق نظر کا آئینہ دار ہے۔ وفات کے وقت بیگم نے تین کروڑ روپیہ چھوڑے اور وصیت کی کہ یہ رقم حضرت نظام الدین اولیا کے درگاہ کے خدام کو عطا کی جائے۔ مگر عالمگیر نے اس رقم کا بہت سا حصہ دیگر رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیا ہے۔

حقیقت میں تیموری حرم میں کس قدر قدسی نفس ہمدرد بنی نوع انساں اور علم دوست ہستیاں موجود تھیں جن کے فیض سے ایک طرف تو علوم و فنون کو ترقی دی دوسری طرف دنیا سے نسواں میں بیداری کی روح پھونک دی اور ثابت کر دیا کہ اپنے طرز عمل سے عورت کی زندگی کے ہر شعبہ میں فرشتہ رحمت اور ہادی کامل ثابت ہو سکتی ہے قدرت نے اسے انسانی زندگی کو

مفید بنانے کے لیے پیدا کیا ہے وہ بلند سے بلند ترین مرتبہ پر پہنچ کر غریب انسان کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ دنیاوی مال و دولت اس کے مقاصد میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ جاہ و جلال اسے فرائض منصبی کی بجاوری سے روک سکتا ہے۔

ملک کی خواتین جہاں آرا بیگم کی خوبیوں سے سبق حاصل کر سکتی ہیں

بیگم۔ علم قرأت، حدیث، فقہ، موسیقی، علم طب اور دیگر علوم پر ملک رکھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو نظم و نثر اور تاریخ پر بھی عبور حاصل تھا، بیگم کی زبان میں روایتی عبارت کی رنگینی چھوٹے چھوٹے فقروں کی کشش قاری کو غمور کرتی ہے اس کے خطوط اس کی انشا پر داری اور شاہی خاندان کا امراء اور ہندو مسلم تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور ان کو شاہی خاندان کس نظر سے دیکھتا تھا۔

مضمون کے آخر میں اورنگ زیب اور جہاں آرا بیگم کے خطوط اور جہاں آرا نے راجہ بدھ پرکاش کو جو خطوط لکھے ہیں ان کو تحریر کیا گیا ہے۔ راجہ بدھ پرکاش کے خطوط سے تمہوریہ خاندان کی مذہبی رواداری اور ہندو مسلم شگفتہ تعلقات کا علم ہوتا ہے جو اس دور کے لیے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔

کچھ جاہل اور حاسد مغربی سیاحوں نے جو ہند کے تمدن سے ناواقف تھے بے بنیاد من گھڑت افسانے جو افواہوں پر منحصر ہیں، بیخ ترین عبارت میں مسلمان شہزادوں اور شہزادیوں کے اخلاق و کردار و عادات کو داغدار کرنے کے لیے اپنی کتابوں میں تحریر کر دیے ہیں وہ ضمیر کش سیاح جو یہاں کے دربار اور حرم کے وقار کو دیکھ کر حسد اور بغض رکھتے تھے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ جس طرح مغربی دنیا کے شاہی خاندان میں جو باتیں پائی جاتی ہیں وہی باتیں یہاں بھی موجود ہیں اسی قیاس آرائی اور خیال سے ایسی ہی باتیں تحریر کرتے چلے گئے جو سراسر غلط ہیں۔

امام از مولانا محمد علم الدین، اسلام آباد کالج، لاہور

ڈاکٹر برنیر چند ٹکوں کی خاطر شہنشاہوں کو بقائے دوام کا تاج عطا کرتا ہے ایسے ہی سیاح جو ہماری قوم و ملت کے دشمن تھے وہ صحیح بات کیوں کر لکھ سکتے تھے۔ ان سیاحوں نے واقعات کو غلط بیان ہی نہیں کیا بلکہ سمجھا بھی غلط۔ سب سے بڑا افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک کے غلام موترخ جو انھیں کے شاگرد تھے انہیں کے نظریات اور خیالات کو دہراتے رہے چند ایماندار مغرب کے سیاحوں مسٹر کارٹو جیسوں نے ان کے بیانات کی تردید بھی کی ہے۔ مسٹر کارٹو کا بیان ہے کہ:

”جہاں آرا اگر ایک طرف نہایت حسین اور صاحب جمال تھی تو دوسری طرف حد درجہ کی روشن دماغ بھی تھی وہ لگاؤ جو اس کو اپنے باپ سے وہ پیار جو شہنشاہ کو اپنی چہتی بیٹی سے تھا اس قسم کا ہے کہ عام آدمی کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔“

جہاں آرا کے بارے میں سب حاسد اہل دربار اور نا سمجھ سیاحوں کے بیانات بے بنیاد ہیں، جو صرف پروپیگنڈہ کی حیثیت کے سوا کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ غور فرمائیں، ان سیاحوں کی شہزادوں تک کس طرح پہنچنے کی رسائی ہوئی ہوگی جبکہ وہ بادشاہوں کے دربار اور شہزادوں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے صرف ان کا تعلق رہا بھی تو امرا تک دوسرے یہ کہ اگر اس طرح کی کچھ باتیں ہوتیں تو اس زمانے کے موترخ اپنی تصانیف اور تذکروں میں ضرور ذکر کرتے۔

ثبوت کے طور پر مغرب پرست دوست لعل خاں کبیل پوشش کا سفر نامہ انگلستان دیکھ سکتے ہیں جس کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ انسانی فطرت ہر جگہ اور ہر مقام پر یکساں ہے اور لعل خاں اسی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا کہ وہ ان لوگوں کی نظر میں ایک انوکھی شخصیت تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ مغرب کے ان بے درد واقعہ نگاروں نے اپنا اثر و رسوخ جتانے کی خاطر یہ واقعات اپنے من سے گھڑ کر تحریر کر دیے ہیں۔

اورنگ زیب اور جہاں آرا کے خطوط جہاں آرا کے نام

یہ مشتاق مخلص اخلاص کے فرائض بجا لا کر
عرض کرتا ہے آپ کا عنایت نامہ جو اعلیٰ حضرت کے پاک
حکم کے مطابق میری عرضداشت کے جواب میں جو میں نے
غزنین سے، بادشاہوں کو پناہ دینیوالی درگاہ میں بھیجی
تھی، لکھا گیا تھا، جمعرات کے دن راستے میں ملا اور نہایت
ہی شادماں کیا اور میں نے اس عنایت نامہ کے مہربانی سے
بھرے ہوئے مضمون پر اطلاع پائی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے
کہ یہ خیر خواہ اعلیٰ حضرت کے شرف رکھنے والے حکم کی
بجا آوری اور فرماں برداری کا عاشق ہے اور اس حقیقت کو
اپنی زندگی کا حاصل جان کر خزانوں کی آرزو نہیں رکھتا
ہے اور ساتھ ہی ساتھ درویش ہونیکا بھی کبھی دعویٰ نہیں
کیا ہے۔ یہ مرید..... بہت ہی عزت
کرنے والا ہے اور طاعت کے لازمی فرض سمجھتا ہے۔
(انتخابات رقعات عالمگیر)

جہاں آرا کا خط اور نگ زیب کے نام

”خدا کا شکر ہے کہ انصاف پسند شہنشاہ کی ذات

مقدس تمام جسمانی عوارض سے مبرا ہو گئی ہے اور ظل سبحانی ملک کے امن اور نظم و نسق پر پوری توجہ مبذول فرما رہے ہیں اور اپنی انصاف شعاری کی وجہ سے پسند نہیں فرماتے کہ کوئی ایسی حرکت عمل میں آئے جس سے ملک میں انتشار پھیلے یا خلقت کو تکلیف و ضرر پہنچے، بالخصوص اپنے فرزندوں کی طرف سے اپنی بیماری کے دوران میں ملک میں جو فتنہ پیدا ہو گیا تھا اعلیٰ حضرت اسکے تدارک میں مشغول ہیں اور اس فتنہ و فساد کی آگ کو جو شہروں کی تباہی اور خدا کی مخلوق کی خرابی کی جڑ ہے، بجھانے میں مصروف ہیں۔ ظل سبحانی کو خاص طور پر عقلمند بھائی کی ناشائستہ اور نا زیبا حرکت سے سخت تکلیف پہنچی ہے اور اس لیے خیر خواہی کی بنا پر چند کلمات تحریر کئے جاتے ہیں تاکہ دلوں کی خس و خاشاک دور ہو جائے۔ اگر اُس والا گہربھائی کی غرض اس فساد کی آگ کو بھڑکانا اور جنگ و قتال ہے تو وہ خوب ہی انصاف فرمائیں کہ مرشد اور قبلہ، حقیقی کے مقابلہ میں جنکی رضا جوئی خدا نے عزوجل اور رسول (ﷺ) کی خوشنودی ہے جنگ و جدل کا ہنگامہ برپا کرنا جسمیں

بیگناہوں کا خون بہایا جا رہا ہے، اور آنحضرت پر بیر و تفنگ چلانا کس درجہ ناشائستہ حرکت ہے۔ اس کا پھل سوائے بدنامی اور بدی کے کچھ نہیں۔ اور اگر دشمنی اور قتل و غارت کا ہنگامہ شہزادہ 'بلند اقبال' (دارا شکوہ) کے لئے ہے تو یہ بات بھی عقلمندی کے مذہب میں نہایت ناپسندیدہ ہے اس لئے کہ بڑا بھائی بھی شرعاً اور عرفاً باپ کے برابر ہے۔ بہر حال یہ جنگ اور خونریزی اور فتنہ انگیزی اُس عقلمند والا گھر بھائی کی جانب سے جو اپنے اطوار اور اخلاق کی خوبیوں سے متصف ہے اور انکی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے اور جس نے ہمیشہ شہنشاہ کی رضا جوئی کو اپنا شعار رکھا ہے، کسی بنا پر پسندیدہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس دار فانی کے چند روزہ قیام میں ایسے مذموم امور کا ارتکاب نہایت درجہ نامناسب ہے۔

مکن مکن کہ نکو گوہراں چنیں نکنند

مناسب یہ ہے کہ وہ نامدار بھائی ان افعال شنیعہ سے جو عاقبت میں رسوائی کا باعث ہیں، اجتناب کرے اور دین پرور اور معدلت گستر شہنشاہ کے مقدس دل کی رضا جوئی میں جہاں تک ممکن ہو سعی کرے اور آنحضرت کی خوشنودی کو دارین کی سعادت کا سبب سمجھ کر خاتم النبیین (ﷺ) کے ماننے والوں کی خونریزی سے رمضان کے

اس مبارك مہینہ میں محترز رہے اور مرشد، ولی نعمت اور والی سلطنت کے احکام کو جان و دل سے عمل میں لائے۔ اسلئے کہ ”کما اولی الامر منکم“ کی آیت کے مطابق ان کے احکام کی پابندی شہنشاہ حقیقی کے احکام کی پابندی ہے اور خلیفہ الہی کے منشا کے خلاف چلنا خدائے برتر کے فرمان کی خلاف ورزی ہے۔ اگر دلی غرض اور مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو اس صورت میں بھی دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس سر زمین میں جہاں قیام کا خیمہ نصب ہے، توقف کیا جائے اور ہر مطلب کو جو دل میں ہو تحریری طور آنحضرت کے حضور میں پیش کیا جائے تاکہ خاطر عزیز کی خواہش کے مطابق اُسے عملی جامہ پہنایا جائے اور مقاصد برآری میں سلطنت و جہاں بانی کی آنکھ کی ٹھنڈک کے اغراض کی تکمیل میں سعی کی جائے۔“

اورنگ زیب کا خط شاہ جہاں کے نام

(اورنگ زیب نے کسی مصلحت سے بہن کے خط کا جواب تو نہ دیا مگر جہاں آرا کے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ جو جہاں آرا کا خط لایا تھا، مندرجہ ذیل عرضی باپ کے نام بھیجی:—)

”اس زمانہ میں سلطنت کے اہم کام اور ملکی و مالی امور حضرت کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور سب اختیار شہزادہ ‘کلاں (دارا شکوہ) نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اس حد تک کہ معرض تحریر میں نہیں آسکتا۔ جو اقتدار اسے حاصل ہو گیا ہے اسے وہ اپنے بھائیوں کے استحصال میں صرف کر رہا ہے۔ چنانچہ سلیمان شکوہ ایک زبردست فوج کے ساتھ شاہ شجاع کے مقابلہ پر جو آنحضرت کا صاحبزادہ ہے مقرر ہو چکا ہے اور اسطرح سے اس نے بتیس سالہ حکومت کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اسی طرح نفسانی خواہش سے مجبور ہو کر وہ اس نیا ز مند کی تخریب میں بھی پورے طور پر ساعی ہے اور ایسے افعال اس سے سرزد ہو رہے ہیں جو شہروں اور عوام کو تباہی سے دوچار کر رہے ہیں اور اسنے آمدنی کے سارے دروازے اس خیر خواہ پر بند کر دئے ہیں۔ (اس کے بعد دارا شکوہ کی مختلف شکایتیں کی گئی ہیں اور پھر لکھا ہے:۔) جب معاملات حد کو پہنچ

گئے اسوقت اپنی جان اور اپنے ناموس کی حفاظت کی خاطر تقاضائے دانشمندی سے مجبور ہو کر سدرہ جیسی اونچی درگاہ تک آپہنچا تاکہ حضور کی خدمت عالی میں تمام معاملات پیش کئے جائیں۔ جب یہ خیر خواہ مسافت طے کرتا ہوا دکن سے اجین کے نواح میں پہنچا، تو وہاں دیکھا کہ جسونت سنگھ شاہزادہ کلاں کے اشارہ سے اس خیر خواہ کی ایذا رسانی پر مقرر ہے۔ اس نے آگے بڑھنے سے روک دیا اور آداب و اخلاق کا لحاظ کئے بغیر نہایت دلیری سے اس بارے میں حکم نافذ کر دیا۔ اس پر فدوی نے چند سمجھدار آدمیوں کو اس جاہل کے پاس بھیجا اور اُسے اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور اس امر کی صراحت کی کہ حضور پر نور قبلہ پناہی کی سعادت دیدار کے حصول کے سوا اس پیش قدمی کا اور کچھ مقصد نہیں ہے۔ مگر وہ ناعاقبت اندیش جو عقل و خرد سے برابر آگے بڑھنے سے روکتا رہا۔ لہذا اس ظالم و جاہل کو اپنے راستہ سے دور کرنا ضروری ہو گیا اور وہ شکست فاش کھا کر حیران و پریشان پھر رہا ہے۔ اور اب شہزادہ کلاں ایک زبردست فوج کے ساتھ دھولپور تک تشریف لے آئے ہیں تاکہ چنبل کے پلوں کو اور دوسرے راستوں کو اس عریضہ گزار پر بند کر دیں۔ اس نے مختلف مقامات پر اپنے آدمی مقرر کر دیے ہیں تاکہ اس خیر اندیش پر سارے راستے مسدود

ہو جائیں۔ چونکہ اس مرید کا ارادہ حضور پر نور کے دیدار کے سوائے اور کچھ نہیں تھا اسلئے یہ مرید دریائے چنبل کو بھداور کی راہ عبور کر کے خدمت اقدس میں روانہ ہو گیا۔ اور ایسا سنا گیا ہے کہ وہ اس مخلص کے حضور کی خدمت میں خاک بوس ہونے کی سعادت کے صدمہ سے قتل و غارت کی آگ بھڑکانے پر تیار ہو گیا ہے۔.....“ مے چاہئے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے خلل پیدا ہو۔ اگر غرور اور تکبر کے جذبہ میں اور مددگاروں کی کثرت کے زعم میں وہ لڑائی کا بازار گرم ہی کرنا چاہتا ہے تو پھر اس صورت میں یہ عقیدت مند فدوی بھی دریغ نہ کریگا۔ بہتر یہ ہی ہے کہ بزرگی کو کام میں لاتے ہوئے اور کروفر کی بساط کو طے کرتے ہوئے وہ حضرت صوبہ، پنجاب میں جو آنجناب کی جاگیر میں ہے، واپس چلے جائیں اور کچھ عرصہ تک اس خیر خواہ کو حضور کی معیت میں رہنے دیں بعد کو جو کچھ حضور کی رائے کے آئینہ میں ظہور میں آئے اس پر عمل کیا جائیگا۔“

اورنگ زیب کو اپنے والد ماجد کے انتقال سے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ وہ خط و کتابت حسب ذیل ہے:-

اورنگ زیب کا تعزیتی خط

”جہان کا پیدا کرنے والا جو بڑے مرتبہ والا ہے، اس عنایت فرما بہن کو اس حادثہ، عظیم میں صبر جمیل عطا فرمائے اور اجر عظیم بخشے! اس قضیہ، ناگزیر کی وجہ سے خاکسار کے غمگین دل پر جو کیفیت گزر رہی ہے اس کے بارے میں کیا لکھا جائے اور وہ حیطہ، تحریر میں سما بھی کب سکتی ہے! قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ اس جگر دوز واقعہ کی نسبت کچھ لکھے! اور زبان میں اتنی قوت کہاں کہ اس صبر ربا غم کے متعلق کچھ بیان کر سکے۔ اُس صاحبہ کے غم اور اندوہ کے تصور سے اس بیتاب دل میں اکثر رقت اور اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن خدائی تقدیر اور آسمانی فیصلہ کے سامنے عاجزی اور تسلیم کے سوائے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ جتنی مخلوقات روئے زمین پر ہے، وہ سب فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائیگی جو بڑی عظمت اور عزت والا ہے۔

بہر حال اس خاکسار کو انشاء اللہ..... سمجھیں۔

یقین ہے کہ سب تعزیت داروں، بالخصوص اکبر آبادی

محل ✽ کو مناسب تسلی دیدی گئی ہوگی۔

میری مہربان! جو چیز اس وقت آنحضرات کے کام آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے ذریعہ اور مستحقین کو خیرات کے ذریعہ ثواب پہنچایا جائے۔ اس بارے میں کوشش فرمائیں اور اس کا ثواب آنحضرات کی روح پاک کو پہنچائیں اور یہ گنہگار بھی اسی کام میں مصروف ہے۔ امید کہ یہ مشورہ شرف قبولیت حاصل کریگا!

جہاں آرا کا جواب

”خدائے برترو بزرگ بادشاہ عالمگیر کی برکت کا سایہ جہاں والوں پر ہمیشہ قائم و برقرار رکھے! اور قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ اس جانگداز مصیبت کا حال لکھ سکے اور اس روز سیاہ کی کیفیت کا ذرا سا بھی حال معرض تحریر میں لا سکے! اور زبان میں اتنی قدرت کہاں کہ جو کچھ گزر چکا ہے اسے ذہن نشین کرائے! جو کچھ مصیبت مجھ پر آرئی ہے اگر سمندر پر پڑتی تو وہ خشک ہو جاتا اور اگر دن پر آتی تو اس کی کیفیت شب دیجور کی سی ہو جاتی۔ ہر چند عقل جانتی ہے کہ اس قسم کے حادثات میں صبر و

✽ اکبر آبادی محل شاہ جہاں کی ایک بیوی تھی جس کا اصل نام عزیز النساء تھی۔ یہ آخر وقت

تک شہنشاہ کے ساتھ رہی۔ اس کا انتقال عہد مالکیہ میں ۳۴۱ھ (۱۰۸۸ء) فروری ۱۶۷۱ء کو ہوا۔ اور تک زیب کو اس کا بے حد احترام منظور تھا۔

شکیبائی سے بڑھکر اور کوئی چیز کا رگر نہیں ہوتی اور ہر
چند اس کے سوائے کوئی علاج بھی نہیں ہے کہ انسان رضا و
تسلیم سے متعلقہ آیات الہی اور ارشادات رسالت پناہی کے
روبرو سر تسلیم خم کر دے تاہم رنج حد برداشت سے کہیں
زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ میں غمگین دل اور اشکبار
آنکھوں کے ساتھ اندوہ و ملال آفتاب کی ایک کرن (خط)
مجھ پر پڑی۔ بلاشبہ وہ آب حیات تھا جو اس نیا زمند کی
آتش سوزان پر ڈالا گیا ہے۔ مجبوراً بیچینی اور بیصبری سے
درگزر کرتے ہوئے اس عالی مرتبت سلطنت کے تابناک
ستارے اور اس تاج و تخت کے عالی مرتبت وارث کی
نصیحت کے مطابق دل حزیں کو تسلی دیتے ہوئے اس
گرامی ہستی کی عمر و دولت کی ترقی کے لئے دعا میں
مشغول ہوں امید ہے کہ اُس پسندیدہ سلطان کی ملاقات
کے پانی سے یہ جانگداز آگ بجھ جائیگی اور شام غم کی
تاریکی صبح سعادت کی روشنی میں تبدیل ہو جائیگی۔
آنحضرات کے تعزیت داروں بالخصوص اکبر آبادی محل
کے ساتھ مہربانی آمیز سلوک کے بارے میں جو اشارہ ہوا
ہے، وہ ظاہر اور بدیہی ہے اس لئے کہ جس قدر اشخاص
باقی رہ گئے ہیں وہ سب کے سب انہی کی (یعنی بادشاہ کی)
عنایت اور توجہ پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس بارے میں اور
کیا لکھا جائے جو ان پر ظاہر نہیں!

خطوط بنام بده پرکاش

علیه العالیہ

شاہ جہاں

بنت

(۱)

جہاں آرا

زیدۃ الاماثل والاقران قابل مرحمت والا حسان راجہ بده
پرکاش بالتفات امیدوار بده بداند عرضد اشتی کہ دریں ولا
باچند جانور و ذالی انار تفصیل مرقوم فرد جدا گانہ بطریق
پیشکش ارسال داشته بود، بوساطت بار یافتگان آستان
قدس نشان رسیده از نظر مبارکہ گزشت و آنچه معروض
داشته بود کہ سفارش او ربخدمت حضرت خدیو زمیں و زمان
، خداوند مکین و مکان ، ذریعہ، آرامش عالمیان نموده آید،
معلوم رای عالم آرا گردید۔ چون حضرت سلاطین پناہ
بمبارکی در مبارکی درمستقر الخلافہ اکبر آباد دارند و ما
بدولت درینجا ایم بدین وجہ تحصیل مطلب او در توقف
ماند۔ توجہ مارا شامل حال خود داند۔

بتاریخ شانزدہم جہادی الثانی سنہ سیزدہ جلوسی

(۲)

زبدۃ الاماثل والاقران لایق المرحمہ والا حسان مطیع
الا سلام راجہ بده پرکاش یہ عنایات او التفات سرافراز بده
بداند عرضد اشتی کہ دریں ولا باہلیلہ و انار ترش و نربسی
و مرغ زرین و نافہ باستان تقدس نشان ارسال داشته بود،

رسیده، بوساطت تتق نشینان عظمت و جلال به نظر فیض
اثر گزشت. مرغ زرین دیگر بهمر سانیده ارسال داردواز راه
عنایت از پیشگاه فضل و کرم خلعت برای او عطا شده پرتو
و صول اجگنده سعادت اندوز خواهد گردانید. التقات مارا
شامل حال خود داند.

بتاریخ یازدهم شهر شوال سنه چهارده قلمی شده

(۳)

زبدة الاماثل والاقران لایق رحمت واحسان مطیع
الاسلام راجه بده پرکاش به عنایت و التقات امیدوار بوده
بداند عرضداشتی که درین ولا با نافهائی مشک و چنور
بطریق پیشکش ارسال داشته بود، رسیده بوساطت تتق
نشینان سرادق عظمت و جاه بنظر کیمیا اثر گزشت. وجه
پیشکش مذکور درجه، پذیرائی یافت و آنچه حقیقت سوندها
و غیره تحویلداران خود و مال ضامن و حاضر ضامن شدن
زمینداران پرگنه سادهوره و باز گریزایندن زمینداران مسطور
آنها را بامتاع تقدو جنس استدعا اینکه درین کاده بروح الله
خان فوجدار میان دو آب و داور خان فوجدار سهرند و علی
اکبر امین فوجدار پرگنه سادهوره نشان عالیشان شرف
صدور یابد، معروض داشته بود،... رای عالم آرا گردید.
معلوم باد که آن زبدة الاقران خطا کرد که باز آنها را با اعتماد
ضامنی زمینداران پرگنه مذکور نگاهداشت. چون ما درین

قسم معاملات بادشاهی دخل نمی وبکسی چیزی نمی نویسیم الحال او درین باب عرضداشت بدرگاه سلاطین پناه ارسال دارد تا از حضور لامع النور بنام هر کدام حکم صادر شود آنها برطبق حکم والا زمینداران و تحصیلداران او رابسته با متاع نزد او بفرستند تا آنکه این حقیقت به عرض شرف اقدس اعلیٰ نرسد، روح الله و غیره هرگز بسته نخواهند فرستاد.

بتاریخ بست و یکم ربیع الثانی سنه ۱۸ جلوسی

(۴)

زبدۃ الامثال والاقران بده پرکاش به عنایت امیدوار بوده بداند عرضداشتهای متواتر که مع دو صندوق برف بجناب قدسیه ارسال داشته بود، سید، از نظر علیه گزشت. کیفیت مبرهن رای عالم آرای گردید. شما نوشته اید که سید شفیع و بهوری از ذخیره، سرکار برآورده ارسال داشته اند و نوشته آنها به ما نرسیده و برف ہم بسیار چرکین و یخ مطلقا درو نبود. ازین بخاطر ما رسیده که شاید از یخدانهای ما نباشک د و زمیندار گڑھوال نوشته بود که من فرستاده ام. والله اعلم. و دیگر آنکه معروض داشته که بعرض متقدس معلی رسانیده چنان شود که حق بحقدار برسد. ما را آنچه بایست کیفیت قبل ازین بعرض خدمت رسانیدیم. چنانچه حضرت مکرر به بخشیان حکم فرمودند که حسب الحكم

بنو یسید که ہر کہ تعدی و زیادتی خواہد کرد بجزای کردار خود خواہد رسید۔ و اواین طور عرضداشتت نموده و پیش احدی بادشاہی ہم گفته کہ من بر کسی تعدی نہ کردہ ام۔ این حد از قذیم از آبا واجداد من بودہ، اینہا بہ تعدی گرفتہ بودند۔ الحال کہ من قابو یافتم حدود خود گرفتم۔ اواین طور می گوید و شما این طور می گورئید تا وقتی کہ بادشاہ امین نخواہند فرستاد، تحقیق نخواہند نمود و نفس الامر معلوم بندگان حضرت نخواہد کہ فوج تعین نمودن حکم خواہند فرمود۔ باز دراین اثنا کہ بہ سمت دکھن و کابل لشکر می باید عجیب است کہ طرف دیگر فوج روانہ کنند صندوق سابق ہم رسیدہ بود۔ ہر سہ صندوق سابق و حال رسیدند۔

تحریراً فی التاریخ ہفتم شہر جہادی الاولی سنہ ۲۱

قلمع شدہ

(۵)

زبدۃ الاماثل والاقربان لایق العنایت والاحسان راجہ بدہ پرکاش بہ عنایت و التقات امیدوار بودہ بدانند۔ عرضہ داشتہ کہ مع نافہای مشک و ڈالی آنار دین ولا ارسال نمودہ بودید بوساطت باریابان حجاب سراق عظمت و جلال رسیدہ از نظر فیض اثر ما گزشت۔ چون از مشک اول بسیار محظوظیم ازین جہت تاکید نمودہ می شود کہ مشک

تقیلدی نفرستید. در گرفتن مشک مزکور احتیاط تمام نموده
اصل آن را ارسال می نموده باشید. عنایت ما را شامل حال
خود دانید.

تحریراً فی التاریخ ۲۱ شهر رمضان سنه ۲۱ جلوس والا

(۶)

اللہ اکبر

زبدۃ الاماثل و ۱ لاقران لایق العنایت والاحسان راجه
بدہ پرکاش بعنایت امیدوار بوده بدانند، عرضه داشتے کہ مع
پیشکش بازو شہد مرسول نموده بودید، رسیدہ ارنظر فیض
اثرما گزشت. باز چوز بود عوض کردہ گرفتیم و شہد نیز
پسند طبع افتاد. دیگر از مفسدی و متمدی زمیندار سرینگر
کہ معروض نموده بودید، بدہ ہمیشہ میان شہا و اور عناد
میگزردواز بدبختی خود باز نمی آید خوب کردید کہ این
مقدمہ رابہ جناب مقدس معلی ۲ عرضداشت نمودید. و
حقیقت باریدن برف و کوتاہی نمودن عبدالرحمن داروغہ
درگرد آوری برف و اجورہ، مزدوران کہ عرض نموده بودید
معلوم رای عالم آرای گردید. بمومی الیہ نشان عالیشان بتا
کید تمام فرستادہ شک کہ گرد آوری برف بواقعی بکند
واجورہ، مزدوران موافق قرار داد می رسانیدہ باشد. واگر مثل
سال گزشتہ کوتاہی خواہد کرد، نتیجہ، نیک نخواہی یافت.

تحریراً فی التاریخ بست و پنجم ماہ محرم سنہ ۲۲

ہندوستانی اینٹی گنی

بحوالہ جہاں آرابیگم مصنف ضیاء الدین احمد برنی، مضمون سرجادوناتھ سرکار اینٹی گنی یوٹی پس کی لڑکی تھی، ساری عمر کو ارپن میں بسر کی، اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ اس میں موجود تھے۔ اس کے والد کو تھیبز کی حکومت سے ہر طرف کر دیا اینٹی گنی نے اپنے باپ کی اور بڑے بھائی کی بڑی خدمت گزاری کی جس کی سزامیں اس کے بھائی نے زندہ دفن کر دیا۔ یہ لڑکی بھی جون آف آرک اور جہاں آرا کی طرح لا زوال شہرت رکھتی ہے۔

(۱)

طاقتور اشخاص کا زوال، اُن لوگوں کی مصائب جو ایک زمانہ میں دنیوی مرتبہ اور دولت کی انتہائی بلنکی پر گامزن تھے، افکار و آلام جو صحت اور مسرت بخش زندگی شام کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ یہ سب اخلاقی سبق دینے والے پیغمبروں اور غم کی تصویر کھینچنے والے شاعروں کے ہر دل عزیز موضوعات رہے ہیں۔ یہ رحم و خوف کا جذبہ پیدا کر کے ہماری روحوں کو آلائش سے پاک کر دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ بیک جنبش حسب و نسب اور شہرت، دولت مندی اور خوبصورتی کی تفریقوں کو بھی بھالیجاتے ہیں اور

ان اشخاص کو جو زمین پر سب سے بڑے کہلاتے ہیں، ادنیٰ درجہ کے اشخاص کی سطح پر لے آتے ہیں۔ اسوقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ نبی آدم آنسوئوں کی وادی میں برابر کے بھائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن قسمت کی ناپائیداری ایسا گیت نہیں ہے جو تاریخ میں ہر ایسے المیہ کے آخری سین میں سنا جاتا ہو۔ استفادہ، لذاذ زندگی کا انتہائی مقصد نہیں ہے اور نہ وہ انسانی قوت برداشت کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔

زندگی کوئی بیکار دھات نہیں ہے، بلکہ وہ لوہا ہے جیسے گہری تاریکیوں سے کھودا گیا ہو، اور جلا ڈالنے والے خوف سے گرم کیا گیا ہو، اور غم آلود اشکوں کے پانی میں ڈبو یا گیا ہو، ورتبا ہی کے صدموں سے پٹ پٹ کر اسنے شکل اختیار کی ہو اور قابل استعمال بنا ہو۔

بعض اوقات غم و آلام کے کانتوں کا تاج فرض منصبی کی ادائگی، بہادرانہ صبر اور خود فراموش قربانی کے ذریعہ روحانی روشنی کے ہالہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسوقت بدنصیبی کی تلخیوں کا شکار اُس بدترین ضرب پر فتح پالیتا ہے جو وہ پہنچا سکتی ہے اور پھر وہ پہلے کے مقابلہ میں شان و شوکت کے زیادہ بلند کنگورہ پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ زندگی میں واقع ہو سکتا ہے، یہ ایک ایسے نام کی

حیثیت بھی اختیار کر سکتا ہے جسکی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمانہ آئندہ کی محبت کرنے والی نسلوں کے دلوں میں محفوظ رہے۔

(۲)

خود ہمارے ملک میں ایک ایسی مبارک ہستی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی ذات تھی۔ جیسا کہ ایک فرانسیسی شاعر نے کہا ہے کہ جب (۱۶۱۲ء میں) ”اپنی نسل کا یہ پھول پہلے پہل کلی کی شکل میں نمودار ہوا، شہنشاہ اکبر کا آفتاب ابھی تک نیلگوں آسمان پر ضوفشانی کر رہا تھا۔“ (یہ خیال اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسوقت تک ہندوستان کا آسمان عہد اکبر کی شفق سے تابناک ہو رہا تھا) اپنے والد کے عہد حکومت کی ابتدا میں اپنی والدہ کے انتقال (۱۶۳۱ء) کے بعد وہ ملک کی سب سے بڑی خاتون اور شاہان مغلیہ میں سب سے جلیل القدر شہنشاہ کے تخت و تاج کی طاقت بن گئی اور ۲۷ برس تک اسی اعلیٰ منصب پر فائز رہی۔

چوبیس برس کی عمر تک اسکی زندگی سرتا پا مسرت اور شان و شوکت میں گزری اور کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جو اسکی تابناک زندگی کو دہنڈلا کرنے والا ہو۔ ہندوستان کے دوسرے حصے کے خود مختار بادشاہ،

سلطنت مغلیہ کے خراج گزار رافہ اور نواب، شاہی خاندان کے افراد اور سلطنت کے امرا۔ سب ہی اپنی اپنی تکلیف میں اس کی مہربانی آمیز سفارش کے جویا رہتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی درخواست امداد رد ہو گئی ہو۔ وہ بے انتہا دہلت کی مالک تھی۔ اسکی جلیل القدر ماں ممتاز محل جو ترکہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی، اس میں سے نصف رقم یعنی ۵۰ لاکھ روپیہ اسے دیا گیا تھا علاوہ اسکی وسیع سالانہ آمدنی کے اور سورت کے محاصل کے جو اپنے وقت میں ہندوستان کی مالدار ترین بندرگاہ تھی۔ بادشاہوں اور شہزادوں، امیروں اور کم درجہ کے افسروں کے پاس سے جو تحفے تحائف اسے ملتے تھے وہ اُن تحائف سے دوسرے نمبر پر ہوتے تھے جو خود شہنشاہ کو ملا کرتے تھے۔

اور اس کے باوجود وہ اپنی ساری دولت اور اثر غرور و تمکنت کو ترقی دینے یا

یا لذائذ دنیا سے متمتع ہونے میں صرف نہیں کرتی تھی، بلکہ دوسروں کی بھلائی اور بہبودی کے کاموں میں اسے خرچ کر ڈالتی تھی۔ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں وہ تیمار دار کے لقب سے مشہور تھی۔ مصیبت زدوں کی مصیبتوں کو ہلکا کرنے، شاہی خاندان کے تنازعات کا خوش اسلوبی سے فیصلہ کرانے، یتیموں کی پرورش کرنے

اور اپنی شرافت اور سلیم الطبع کے ذریعہ مجرمین پر سے شاہی عتاب کا رخ موڑنے میں وہ اپنی قوتیں صرف کرتی تھی۔

وہ غم سے آشنا ہو چکی تھی۔ اسکی پیاری ماں کا۔ مائیں عام طور پر سب سے بڑی بیٹی کی ساتھ بیچہ کی بجائے بہن اور دوست کی طرح پیش آتی ہیں۔ اس کی ماں کا انتقال اس وقت ہوا تھا جبکہ اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ گیارہ سال بعد وہ اتفاقیہ طور پر بری طرح جل گئی اور چار مہینے تک تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ اس نے شادی نہیں کی اور ماں بننے کی سعادت بھی جو عورت کی زندگی کی بلند ترین خواہش کی تکمیل ہوا کرتی ہے۔ اسے نصیب نہیں ہوئی۔

دنیوی عظمت کی انتہائی بلندی پر پہنچنے کے باوجود اسکی روح خدا کی طرف رجوع رہتی تھی اور وہ حضرت میاں میر (لاہور) کے مریدوں کے سلسلہ میں منسلک ہو گئی تھی۔ اس نے حضرت شیخ معین الدین چشتی کی جو حضرت میاں میر سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں، زندگی اور تعلیمات کا مطالعہ کیا تھا اور ”مونس الارواح“ کے نام سے فارسی زبان میں ان کی زندگی پر ایک مختصر رسالہ بھی تحریر کیا تھا تا کہ دوسرے

لوگ جو روحانی روشنی کے متلاشی رہتے ہیں اس سے مستفید ہوں۔

(۳)

شاہی گھرانے کے اندر اسکی زندگی کا مقدس مشن صلح کرانے والے کا تھا۔ اسکے بھائی اپنے دکھ درد میں اس سے اپنے دل کی باتیں کہتے تھے۔ دارا جو اُن سب میں بلحاظ عمر اس سے قریب ترین تھا (اسلئے کہ وہ صرف ایک سال چھوٹا تھا) اس سے شدت سے محبت کرتا تھا اور وہ خود بھی اسکے خیال، مقاصد، حتیٰ کہ صوفی کی حیثیت سے اسکے روحانی مشاغل کی ہمنوا تھی، اور اس نے دارا کی بیوی کے ساتھ بہن کا سا سلوک کیا تھا اور شاہی جوڑے کی درد ناک موت (۱۶۰۹ء) کے بعد ان کی یتیم بچیوں کی پرورش ایسی محبت سے کی تھی گویا کہ وہ خود اسکے اپنے بچے ہیں، حتیٰ کہ خشک مزاج اور پیش بین اورنگ زیب بھی جو دارا اور دارا کے رفقا سے پیدائشی نفرت رکھتا تھا، اسی سے رجوع ہوتا اور دکھ درد کی داستان بیان کرتا تھا جیسا کہ ذیل کے خط سے معلوم ہونے لگا:

اورنگ زیب بنام جہاں آرا (۱۶۵۷ء)

”یہ امر آپ ہوایدا ہے کہ جب سے شہنشاہ نے منصب سے سرفراز فرمایا ہے میں نے حتی المقدور اور حتی

الوسع اُس فرض کی بجائے آوری کی ہے جو مجھ پر ڈالا گیا تھا..... مجھے معلوم نہیں کہ اب مجھ سے ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی جس کی بنا پر انہوں نے مجھ جیسے وفادار خادم کے خلاف ایسی کارروائیاں کی ہیں جن کا میں مستحق نہیں ہوں اور جو دور و نزدیک کی نظروں میں میری بے عزتی اور رسوائی کا موجب بن رہی ہیں۔ اولاً قلعہ، اسیر پہلے مجھے عطا کیا گیا تھا اور پھر بھائی مراد بخش کو اور بالآخر پھر مجھے عطا کر دیا گیا تھا، لیکن اب ایک حکم موصول ہوا ہے کہ مجھے وہاں اپنا قلعہ دار نہ بھیجنا چاہئے!...

”خدا جانے شہنشاہ کی طرف سے مجھ پر اسقدر بے اعتمادی اور ناخوشی کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے اللہ کہ جان و مال کی پروا کئے بغیر جو وفادارانہ اور نمایاں خدمات میں نے گزشتہ بیس سال میں آنحضرت کے لئے انجام دی ہیں، سہ میرے بھتیجے (سلیمان شکوہ) کی خدمات کے برابر بھی نہیں سمجھی گئیں۔“

”ثانیاً اب دا دا بھائی جیو (دارا شکوہ) نے اور آنحضرت کو بخوبی معلوم ہے کہ انہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔ اپنے کا رندہ ملا شوقی کو اس جگہ (دکھن میں) مامور کر دیا ہے تاکہ وہ والی بیجاپور کو خوش خبری سنائے

اور بتائے کہ (آنحضرات نے) اسکی عرضداشتوں کو شرف قبولیت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موخرالذکر اور اسکی طرح کے دوسرے لوگ پہلے سے زیادہ سرکش ہو جائیں گے۔ پیاری بہن، اگرچہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ میں شہنشاہ کے مریدوں اور ملازموں کے زمرہ میں داخل ہوں بلکہ ہمیشہ اپنے تئیں حضور کا غلام ہی سمجھا ہے اور ہمیشہ اس سلوک پر قانع رہا ہوں جو شہنشاہ کی طرف سے مجھ سے برتا جا رہا ہے۔ تاہم چونکہ میں نے اپنی زندگی عزت اور احترام میں بسر کی ہے اور اس صوبہ پر بغیر کسی درخواست کے اور خود آنحضرت کے حکم سے اسکے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکومت کی ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کارروائی کا نتیجہ میری بے عزتی اور معزولی کی شکل میں نکلے گا۔ میں پریشانی کے بھنور میں پھنس گیا ہوں اور نہیں سمجھ سکتا کہ آنحضرت میرے متعلق کیا ارادے رکھتے ہیں..... اگر حضور کی یہ خواہش ہے کہ ان کے تمام ملازمین میں اکیلا میں اپنی زندگی کے دن بے عزتی میں گزاروں اور بالآخر ناسزاوار طریقہ پر تباہ برباد کر دیا جائوں (یعنی اپنے سب سے بڑے غاصب بھائی کے ہاتھوں قتل ہو جائوں) تو پھر میرے پاس اور کوئی چارٹہ کا رہیں ہے کہ میں سر تسلیم خم کر دوں۔ لیکن چونکہ میرے

لئے اس طرح کا جینا اور مرنا مشکل ہے.... اسلئے بہتر یہی ہے کہ میں آنحضرت کے حکم سے ایسی زندگی کی شرم سے چھٹکارا پائوں۔ میرا سر اور میری جان آنحضرت کی خوشنودی کی خاطر ہر وقت قربان کیجا سکتی ہے۔ تاکہ بعض لوگوں کے دل میری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔

”دس سال سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہے اور اسکے بارے میں مجھے پورا یقین ہو چکا ہے کہ وہ (یعنی دارا) میری جان لینے کے درپے ہیں اور اسی لئے میں نے اپنے عہدوں سے استعفا دیدیا تھا، لیکن بعد کو محض والد ماجد کی خوشنودی کی خاطر میں نے (دوبارہ) اس زندگی کو اختیار کر لیا.....“

(۴)

جہاں آرا کے لئے انتہائی آزمائش کا زمانہ ۱۶۵۷ء میں آیا۔ اسکا باپ شاہ جہاں سخت بیمار ہو گیا تھا اور اسوقت چاروں بھائی مسلح ہو کر تخت کے حصول کی جدوجہد میں لگ گئے حالانکہ شاہ جہاں کی آنکھ ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ اس دردناک سانحہ کی داستان میری تاریخ

✽ آداب عالمگیری میں جہاں آرا کے نام اور نگ زیب کے ۲۸ خطوط ہیں جن میں سے ۱۸

محض رسمی اور میکار ہیں، اور دو بہت اہم اور طویل ہیں۔ ان دو خطوط میں سے ایک کے اقتباسات اوپر دئے گئے ہیں۔ اسے لفظاً اور نگ زیب کے استغفے سے دس سال بعد کا خط نہیں سمجھنا چاہئے۔ یعنی ۱۶۵۴ء کا، بلکہ اسے ۱۶۵۷ء کا خط سمجھنا چاہئے۔

اورنگ زیب (جلد ۱ و ۲) میں تمام و کمال بیان کر دی گئی ہے اور ایسا کرتے وقت میں نے نہ صرف معاصرانہ دستاویزات پر اعتماد کیا ہے بلکہ اُس ڈرامے میں جو لوگ حصہ لے رہے تھے، میں نے حتی الامکان انہی کے الفاظ میں اسے پیش کر دیا ہے۔ یہاں اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ دارا شاہ جہاں کا منظور نظر مہین پور خلافت تھا، لیکن اورنگ زیب چاروں بھائیوں میں سب سے قابل تھا اور مسلسل کامیابیوں کے ذریعہ وہ آگرہ تک پہنچ گیا تھا جہاں بوڑھا شہنشاہ اُس وقت اقامت گزین تھا۔ دارا آگرہ سے دس میل دور سمو گڑھ کی شکست فاش کے بعد دہلی کی طرف بھاگ نکلا اور اورنگ زیب نے اپنے باپ کو آگرہ کے قلعہ میں محصور کر دیا اور تین دن کی ناکہ بندی کے بعد جس میں مطلق خون نہیں بہایا گیا پانی کی رسانی کو بند کر کے اس کو بلا کسی شرط کے حوالگی قلعہ پر مجبور کر دیا تھا۔

ایسی حالت میں جہاں آرا نے اپنے فتح مند بھائیوں سے (کیونکہ شہزادہ مراد بخش نے اورنگ زیب کے ساتھ اتحاد عمل کر رکھا تھا) ۱۰ جون ۱۶۵۸ء کو آگرہ شہر کے باہر نور منزل میں جہاں وہ خیمہ زد تھے ملاقات کی اور ان چاروں میں سلطنت کی پر امن تقسیم کے اصول پر

مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ لیکن اسکی کوشش ویسی ہی بیکار گئی جیسا کہ وہ خط جو سمو گڑھ کی لڑائی سے پہلے اس نے اورنگزیب کے نام تحریر کیا تھا۔
(۵)

شاہ جہاں کی حکومت سے دست برداری کے بعد جہاں آرا اپنی چھوٹی بہن روشن آرا کے طریقہء کار عمل کا تتبع کرسکتی تھی اور دربار اورنگزیب سے وابستہ ہو کر دولت، عیش و تنعم اور آزادی کی زندگی گزار سکتی تھی، لیکن اس نے اینٹی گنی اورڈیلٹا کا طریق عمل اختیار کیا۔ ایک فرانسیسی شاعرلی کانٹے ڈیلائل (Leconte de Lisle) نے اپنے غمزدہ یاپ کی خاطر اس کے ایثار و قربانی کی داستان کو انتہائی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے جس کے کچھ اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

(میں نے ان طویل شاعرانہ اقتباسات کو غیر ضروری سمجھ کر خذف کر دیا ہے۔ لیکن یہ امر مسرت بخش ہے کہ فرانسیسی شاعری میں بھی جہاں آرا کے گیت گائے جاتے ہیں۔)

(۶)

ساڑھے سات سال تک حالت قید میں رہنے کے بعد شاہ جہاں کا انتقال ۱۶۶۶ء میں ہو گیا۔ جہاں آرا نے آخر وقت تک اسکی تیمارداری کی اور جب سب کچھ ختم ہو

گیا تو اس نے سیدھے سادے طریقہ سے باپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اپنے باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی اورنگ زیب نے اپنی بہن کے نام تعزیت کا خط بھیجا اور جہاں آرانے بھی اسکی تعزیت کے خط کا جواب دیا۔

یہ ۱۶۶۲ء کا واقعہ ہے۔ شاہ جہاں کی موت نے جہاں آرا کو اسکی اپنی پسند کردہ قید سے آزاد کر دیا۔ وہ اب قلعہ سے باہر نکلی اور دہلی شہر میں علی مردان خاں کی سابقہ حویلی میں فروکش ہوئی ایسی حالت میں کہ اورنگزیب اسکی بہت عزت کرتا تھا اور ہر معاملہ میں اُس سے مشورہ لیتا تھا اور دارا کی یتیم بچیوں کی خبری گیری اور رکھ رکھائو کا کام بھی اسی سے متعلق تھا۔ اس طرح وہ کم و بیش اور ۱۵ سال تک زندہ رہی اور جب اس نے ۶ ستمبر ۱۶۸۱ء کو وفات پائی تو اسنے خواہش ظاہر کی کہ اسے اُسی بے چہت کے مقبرہ میں جس پر گھاس لہراتی رہتی ہے، دفن کیا جائے۔ اس قبر کو اس نے شاہ جہاں آباد کی حدود کے باہر حضرت نظام الدین اولیا کے وہیں ہندوستانی اینٹی گنی کا جسد فانی مدفون ہے۔ قبر پر جو کتبہ ہے، وہ حسب ذیل ہے:

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاه بس است

اورنگ زیب اور جہاں آرا بیگم کے خطوط انکے کردار، ذہانت حسن اخلاق سیاسی بصیرت انتظامی صلاحیتوں رعایا اور غربا پروری مصلحت بینی والدین کا احترام مذہبی جذبات بزرگان دین سے عقیدت بھائیوں کے نفاق کو دور کرنے کی کوشش سلطنت کو مستحکم بنانے کے ارادوں بڑے اور چھوٹوں کی خدمت اور خلوص کی سہی عکاسی کرتے ہیں ان خطوط سے اس زمانہ کی سیاسی سماجی مذہبی اور اقتصادی اور اخلاقی زندگی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بدھ پرکاش کی خط و کتابت سے مغلیہ بادشاہوں کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے ان خطوط سے بہت سی غلط فہمیاں جو (جہاں آرا بیگم اورنگ زیب اور شاہجہاں) کے بارے میں متعصب اور جاہل مورخین نے اپنے بیانات سے پیدا کردی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں۔ حقیقت میں یہ خطوط جہاں آرا اورنگ زیب کے کردار و عمل کے آئنے دار ہیں سر جادو ناتھ سرکار کا جہاں آرا کے بارے میں مضمون بیگم کی خصوصیات و صلاحیت اور قابلیت کا نقشہ پیش کرتا ہے اور اسکی زندگی کے تقدس اور پاک دامنی کی مثال پیش کرتا ہے اور دیگر ممالک کی اعلیٰ کی شہزادیوں سے جہاں آرا بیگم کو تاریخی آئنے میں بلند مرتبہ کی مستحق قرار دیتے ہیں۔

روشن آرا بیگم

روشن آرا بیگم جہاں آرا بیگم کی چھوٹی ہمیشہ تھی، وہ عالمگیر سے بڑی تھی۔ جہانگیر کے گیارہویں سن جلوس میں ممتاز کے بطن سے پیدا ہوئی۔ جہانگیر اپنی تنزک میں لکھتا ہے کہ :

”اتوار کے روز یکم رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ کو چار گھڑی اور سات پل گزرنے پر مجھے اطلاع ملی کہ شہزادہ خرم کے حرم سرا میں آصف خاں کی دختر نیک اختر کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔“ (تنزک جہانگیری)

روشن آرا کے پیدا ہونے کے دنوں جہانگیر پربانپور میں تھا۔ شہزادی کا نام روشن آرا رکھا گیا۔ اور نذر و نیاز مسکینوں اور غرباء میں تقسیم کی گئی۔ روشن آرا کی تعلیم و تربیت سستی النساء (ہمیشہ ملک الشعراء طالب آملی) کے سپرد کی گئی۔ سستی النساء نے روشن آرا کو دینی و درسی کتب کے علاوہ علم طب اور دیگر علوم و فنون میں طاق کر دیا۔

روشن آرا بہت حسین و جمیل شہزادی تھی روشن آرا بھی جہاں آرا کی طرح بہت ذہین تھی وہ اورنگ زیب کی حامی اور اپنے بھائی داراشکوہ سے حسد رکھتی تھی۔ روشن آرا محل کی سازشوں کو اورنگ زیب تک پہنچاتی رہتی تھی وہ حرم کی ہر سیاسی بات سے باخبر تھی۔ ممتاز محل بھی اورنگ زیب کو بچپن سے ذہین مانتی تھی اور شہزادہ اورنگ زیب کو بہت چاہتی تھی۔ نورجہاں بھی اورنگ زیب کی ہونہار اور ذہانت، سادگی اور مذہب کی پاسپانی سے بہت ہی متاثر تھی نورجہاں اورنگ زیب کی ہونہاری کی پیش گوئی کرتی ہوئی اس کی کامیابی کے لیے دُعا میں بھی کرتی رہتی تھی۔

ایک بار اورنگ زیب کی سالگرہ کے موقع پر دو ہاتھوں ”سدھا کر“ اور صورت ”سندرہ“ کی کشتی کا تماشا کرایا گیا اس موقع پر شاہجہاں جھروکے میں بیٹھا ہوا تھا اور جہاں آرا اور

روشن آرا بیگم بھی شاہجہاں کے قریب کھڑی تھی اور نگ زیب، داراشکوہ اور شجاع بھی امراء کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تماشادیکھ رہے تھے شہزادہ مراد اس وقت بہت کمسن تھا۔ آخر میں صورت سندو نام کے ہاتھی جو بہت ہی خوشنوار اور مست تھا اور نگ زیب کو مع اس کے گھوڑے کے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر ٹپک نے کا ارادہ کیا تو یہ خوفناک منظر دیکھ کر روشن آرا کی حالت بگڑنے لگی اور بھائی اور نگ زیب کی زندگی کی دعا کرنے لگی، اور نگ زیب نے ہاتھی پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھی تلوار کے وار کے بعد بھاگ نکلا شاہجہاں اپنے جگر گوشہ کی شجاعت دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اور نگ زیب کی بہادری کے اس منظر سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، روشن آرا کو بھی بہت راحت ہوئی۔

روشن آرا میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں موجود تھیں جو ایک مسلم خاتون میں ہونی چاہئے اس کی رعایا نوازی، غرباد پروری سے ہر امیر اور وزیر خوش تھا اور اس کی قیادت سے متاثر تھا۔ مگر روشن آرا کا چراغ جہاں آرا کے سامنے نہیں جل سکا۔

”تیموریوں کا حرم اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر دنیا میں مشہور تھا۔ حرم کی مستورات علمیت فضیلت اور سلیقہ مندی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔“

جب روشن آرا نے آنکھیں کھولیں تو اس وقت نور جہاں کی پالیسیوں سے دربار میں توڑ جوڑ کا ماحول سرگرم تھا اور اسی ماحول سے روشن آرا بھی متاثر ہوئی اور سیاسی توڑ جوڑ میں ماہر ہو گئی۔

نخت نشینی کے وقت شاہجہاں نے جہاں آرا بیگم اور دیگر بیگمات کے ساتھ روشن آرا کو ایک لاکھ روپے بطور انعام اور پچاس ہزار کا وظیفہ اور جاگیریں عطا کیں مگر ان سب کے باوجود جہاں آرا بیگم کا اقبال بلند رہا تمام محلات کا انتظام سستی النساء اور جہاں آرا بیگم کے ہاتھوں میں رہا بغیر ان کی اجازت کوئی کام نہیں ہوتا تھا بڑے بڑے راجے مہاراجے امراء جہاں آرا بیگم سے سفارش کراتے تھے منصب دار کا عہدہ بھی جہاں آرا بیگم کے مشورہ سے ہی عمل میں آتا تھا۔ یہ مقام روشن آرا بیگم کو حاصل نہ تھا۔ جہاں آرا بیگم داراشکوہ کو جانشین بنانے کی حامی تھی۔

اور کئی بار اس نے داراشکوہ کے لیے بادشاہ سے سفارش بھی کی۔ روشن آرا بیگم میں بھی دور اندیشی کی کمی نہ تھی وہ دربار کے ماحول کا تجربہ بھی رکھتی اور عالمگیر کی خوبیوں سے بھی بے خبر نہیں تھی اسی لیے وہ عالمگیر کی حامی تھی۔

بادشاہ کی بیماری، شجاع کی ناکامی اور سموگڈھ کی فیصلہ کن جنگ کے بعد جب عالمگیر کو مٹانے کی خوفناک سازش ہو رہی تھی تو روشن آرا بیگم نے بھی قبل از وقت عالمگیر کو اس سازش سے خبردار کر کے اسے تباہی و بربادی سے بچایا۔ شاہجہاں نے فاضل خاں اور خلیل اللہ خاں کی معرفت عالمگیر کو پیغام بھیجا کہ اسے ولی عہد بنایا جا رہا ہے روشن آرا نے عالمگیر کو اس سازش سے آگاہ کر دیا اور عالمگیر نے خلیل خاں کو اپنا طرفدار بنالیا فاضل خاں ناکام واپس چلے آئے اور پھر عالمگیر نے سلطان محمد کے ذریعہ آگرہ کے قلعہ پر قبضہ کرانے کے بعد عالمگیر نے تخت حاصل کر لیا اور بادشاہ شاہجہاں کو نظر بند کر لیا گیا۔

عالمگیر کے تخت حاصل کرنے کے بعد روشن آرا کا سیاسی وقار بلند ہو گیا۔ دربار میں اس کی طوطی بولنے لگی اسے جاگیریں عطا کی گئیں۔ پانچ لاکھ روپے بطور انعام دیا گیا مگر چند ہی دنوں کے بعد دربار اور شاہی محل میں روشن آرا کی مخالفت ہونے لگی۔ عالمگیر کی بیماری کے وقت روشن آرا نے اسی طرح تیمارداری کی جس طرح جہاں آرا نے شاہجہاں کی بیماری کے وقت کی تھی۔ روشن آرا کے حکم کے بغیر عالمگیر سے کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اب یہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ بادشاہ کی وفات ہو چکی ہے اور اس کے پردہ میں روشن آرا حکومت کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر برنیر کا بیان ہے کہ روشن آرا نے عالمگیر سے شاہی مہر بھی حاصل کر لی ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہو رہا تھا کہ شہزادہ اعظم ابھی کم سن ہے اس کی اتالیق بن کر اس طرح کام کر رہی ہے جس طرح بیرم خاں نے اکبر کی کم سنی کے وقت کیا تھا۔

روشن آرا نے سلطنت میں امن و امان کو برقرار رکھنے کے لیے فرمان بھی جاری کیا کچھ دن بعد عالمگیر ٹھیک ہو گیا تو خود عالمگیر نے سلطنت کے کاموں کو سنبھالا۔ ۱۶۵۷ء میں روشن آرا نے عالمگیر کا جشن صحت منایا جشن کی خوشی میں روشن آرا کو کثیر رقم اور جواہرات عطا کیے۔

ڈاکٹر برنیر روشن آرا کے زوال کے اسباب بیان کرتا ہے کہ "عالمگیر کی بیماری کے آخری ایام میں اس کی والدہ عالمگیر کی صحت کے لیے بہت بیقرار تھی وہ رواداری کے لیے عالمگیر کے پاس جانا چاہتی تھی لیکن روشن آرا نے اس کو نہیں آنے دیا۔۔۔ آخر وہ پہرے داروں کو روپے دے کر بادشاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور اس بات کی شکایت کہ روشن آرا نے اسے آنے سے روکا تھا" اس بات سے عالمگیر روشن آرا سے خفا ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب عالمگیر کا دل روشن آرا کی طرف سے بالکل پھر گیا۔ مگر برنیر کا یہ بیان بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہے۔ کیوں کہ عالمگیر اپنی زندگی کے آخری ایام تک روشن آرا کی پہلی جیسی ہی عزت کرتا رہا اور روشن آرا کا اقتدار بھی اسی طرح رہا اور جاگیریں بھی بدستور رہیں۔ روشن آرا عالمگیر کے بچوں کی آخری وقت اتالیق رہی۔

روشن آرا شان و شوکت کی دلدادہ تھی اس کی سواری کے جلوس کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے، برنیر اس کی سواری کے ایک جلوس کا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے :

"چاہے آپ اپنے تخیل کو وسعت کی انتہائی حدود تک لے جائیں پھر بھی آپ کا دماغ روشن آرا کے جلوس کی صحیح تصویر پیش نہ کر سکے گا وہ پیگو کے ہاتھی پر سنبھری ہوئے میں بیٹھ کر نکلتی تھی، ہاتھی طرح طرح زیورات سے آراستہ ہوتا تھا، اس کے پیچھے پانچ یا چھ ہاتھی اور ہوتے تھے، جن پر محل کی دیگر بیگمات سوار ہوتی تھیں، بیگم کے ہاتھی کے گرد اگر دتاتاری اور کشمیری عورتیں مختلف ہتھیاروں سے مسلح گھوڑوں پر سوار ہوتی تھیں ان قلمافینوں اور بیگم کے درمیان سب سے بڑا خواجہ سراے نہایت شاندار اور زرق برق لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ اس کے بعد پیادے دو رہا ش نیزے اور علم ہاتھوں میں لیے ہوئے جلوس کے ساتھ ہوتے تھے یہ پیادے بیگم کے آگے پیچھے سڑک کے دونوں جانب کھوڑے کھوڑے فاصلہ پر ہوتے تھے اس کے بعد اس کے دربار کا سب سے بااثر منتظم کا

گھوڑا ہوتا تھا جس کے عقب میں دو چار اور ہاتھی ہوتے تھے جن پر بیگم کی خاص الخاص کینیزیں سوار ہوتی تھیں۔ آخر میں پچاس ہاتھی — ایسے ہوتے تھے جن پر امراء کی بیگمات سوار ہوتی تھیں۔

روشن آرا کا انتقال ۱۷ جمادی الاول ۱۰۸۲ھ کو جمعرات کے دن ہوا اس کے انتقال کے بعد عالمگیر کو بہت صدمہ پہنچا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے عالمگیر نے ماتمی لباس پہنا اور بہت سارے نقد خیرات کیا۔ اس کا مقبرہ دہلی میں واقع روشن آرا باغ میں ہے جو اس کی مشہور یادگار ہے یہ نہایت وسیع اور پر فضا مقام ہے اور دہلی کی مشہور سیرگاہ رہا ہے۔ روشن آرا بیگم کی اخلاق کی نمایاں چیز عالمگیر سے محبت ہے وہ عالمگیر کو دل و جان سے چاہتی تھی اور ہر مصیبت اور خوفناک وقت میں اس کا ساتھ دیا۔ عالمگیر کے اقتدار کے لیے وہ ہر قربانی کو تیار تھی۔ روشن آرا ذہین ہونے کے ساتھ دور اندیش بھی تھی، تجربہ اور سیاسی شعور بھی رکھتی تھی وہ شاہی شان و شوکت جاہ و جلال عظمت و عزت کو برقرار رکھنے کی قائل تھی، بیگم کو غصہ تو بہت جلد آجاتا تھا مگر کچھ ہی دیر کا مہمان ہوتا تھا۔

شہزادی روشن آرا بیگم شفیق ہمشیر اور با وفادار رحم دل سرپرست تھی۔ دوسری بیگمات کی طرح اس کی بارگاہ کے بھی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے لیے ہر وقت درگھلے رہتے تھے۔ اپنی آمدنی انھیں کی پرورش پر صرف کرتی تھی۔ وہ مذہب کی بہت پابند تھی نماز کی ادائیگی و رود و وظائف کی کثرت، قرآن پاک کی تلاوت اور پردے کی پابندی، اس کے اخلاق کے جوہر تھے۔ جو ہماری بہنوں کے لیے راہنمائی کا کام دے سکتے ہیں۔

زیب النساء بیگم

”حقیقت میں تیموری شہزادیوں کے علمی جمہور کا گل سرسبز زیب النساء بیگم ہے۔“ زیب النساء بیگم کا پہلا نام زبیدہ بیگم تھا۔ جو بہت ہی حسین و جمیل شہزادی تھیں۔ زیب النساء بیگم دہلیس بانو بیگم کے لطف سے ۱۰ شوال ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء کو صبح چار بجے پیدا ہوئی عالم گیر کی یہ پہلی اولاد تھی، دستور کے مطابق زیب النساء کو قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کام کے لیے اورنگ زیب نے مریم کو رکھا گیا مریم ایک شاہی درباری کی والدہ تھیں اور قرآن حافظ تھیں۔ زیب النساء کو پہلے قرآن پاک حفظ کرایا گیا قرآن پاک کے حافظہ سے خوش ہو کر اورنگ زیب نے زیب النساء کو تیس ہزار اور مریم کو بیس ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں۔

ماثر عالمگیری، عالمگیر نامہ اور مرآۃ العالم کے مؤلفین کا بیان ہے کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

”واز تحصیل علوم عربی و فارسی بہرہ تمام اندوختہ“

بزم تیمور چھ سو میں سید صباح الدین بیان کرتے ہیں کہ زیب النساء بیگم کو ملا سعید اشرف درسی کتب کے علاوہ فقہ اصول فقہ اور علم حدیث کی تعلیم دیتے تھے ملا سعید اشرف ہی نے زیب النساء کو فن شاعری سکھائی اور شاعری کے بھی وہی استاد تھے۔ فن خطاطی میں شہزادی کو کمال حاصل تھا وہ عالم گیر کی طرح خوش خطی اور خوش نویسی میں بھی ملکہ رکھتی تھیں۔ وہ ہر طرح کے خطوط یعنی ”نسخ، نستعلیق، اور شکستہ کو بہت ہی خوبصورتی سے تحریر کر سکتی

۱۔ منشی دین محمد حیات زیب النساء ص ۱

۲۔ آخرا الامراء ج ۲ ص ۸۲۹

۳۔ ماثر عالمگیری اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ص ۳۹۴



ان فلو سے بچیں

ریت الہا میکم

تھی۔ یہ فن بھی شہزادی نے ملا سعید اشرف سے ہی سیکھا تھا کیوں کہ وہ اپنے زمانے کے عالم ہونے ساکتہ ساکتہ معروف خوش نویس بھی تھے۔ انگلیا کرتی کا ایجاد زیب النساء نے کیا تھا۔

زیب المنشات کے حوالہ سے مخزن الغرائب کے مؤلف کے بیان ”زیب المنشات کہ از تالیف الجنباب است فقرآن را زیارت نمود“ سے شہزادی زیب النساء کی اس تصنیف سے اس کے علمی ذوق و قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب شہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ تھا۔ اس کی بیاض ایک حوض میں گر کر ضائع ہو گئی زیب النساء کے نام سے ایک مرقع بھی منسوب ہے جس سے شہزادی کی علمی مجلسوں کا علم ہوتا ہے اور اس میں مشہور کاتبوں اور خطاطوں کے جوہر کے کمالات قطعات اور مصوروں اور نقاشوں کے ہاتھ کی تصاویر تھیں۔ یہ مرقع بھی مجموعہ کی طرح ناپید ہے۔ اس کے دیباچہ کو ملا رضا راشد نے لکھا تھا۔ جو خدا بخش لائبریری میں موجود ہے دیباچہ ملی جلی نظم و نثر میں لکھا گیا ہے۔ شہزادی کی مجلسوں میں مختلف علماء و فضلا میں بحث ہوتی تھی۔ دیباچہ سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ شہزادی طب روحانی سے بھی ذوق رکھتی تھی۔ شہزادی علم موسیقی کی بھی دلدادہ تھی اور اس علم سے بخوبی واقف تھی۔ ”ز موسیقی و از اکانش آگاہ بگوشت استماعش لیک اکراہ“

شہزادی زیب النساء بیگم کے انشا پر دازی اور علمی قابلیت کے بارے میں دیباچہ میں یوں تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بلفظ مختصر معنی مطول عبارت مجمل و معنی مفصل

بعلم اولیٰ تر از چہیزدانی نہ در اعمال گنج حرف ثانی

پروفیسر محفوظ الحق نے بیگم کے مرقع کی نقل رسالہ شمع آگرہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع

۱۰۱ ماثر عالمگیری ص ۳۹۴

سید صباح الدین بزم تیموریہ حصہ سوم میں تحریر کرتے ہیں کہ :

”زریب النساء بیگم کا ذوق شاعری اتنا بڑھا کہ اس کی خدمت میں شعراء اپنے معروضات شاعری ہی میں پیش کرتے تھے“

۱۰۹۰ھ میں بیگم صاحبہ نے ابرک کا ایک بڑا خیمہ بنوایا جو مکمل شیشہ کا معلوم ہوتا ہے مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ :

”بیگم کے درباری شعرو شاعری کے بارے میں عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعراء کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی زریب النساء کے حسن مذاق سے ہو گئی تھی“

زریب النساء بیگم سے اور چار چھوٹی بہنیں تھیں جن کے نام ہیں :

۱- زینت النساء بیگم

۲- زہدۃ النساء بیگم

۳- بدر النساء بیگم

۴- مہر النساء بیگم

زریب النساء بیگم ایرانی ادب اور شعراء کا بہت مطالعہ کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت شعرو شاعری کی طرف زیادہ مائل ہو گئی۔ وہ علم حساب اور علم ہیئت میں بھی اعلیٰ قابلیت رکھتی تھیں۔ شہزادی اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ علماء و فضلاء کی امداد میں خرچ کر دیتی تھیں۔

زریب التفاسیر جو امام غزالی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ زریب النساء نے اپنے نام سے تصنیف کرائی۔ شہزادی کی اپنی خود کی کوئی تصنیف نہیں تھی۔ لیکن شہزادی کے اہتمام میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں شہزادی بہت ہی سادہ طریقہ سے رہتی تھیں زریب و زینت اور ریشمی کپڑوں سے شہزادی کو بہت ہی نفرت تھی چنانچہ ان کو پہننا بالکل پسند نہیں کرتی تھیں

زبیب النساء کے پاس بہت سی کنیزیں رہتی تھیں مگر زیادہ تر کام خود کرتی تھیں وہ کنیزوں پر بھی خفا نہیں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک کنیز سے جو شاعرہ بھی تھی قیمتی چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا۔ کنیز نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

”از قضا آئینہ چینی شکست“

زبیب النساء نے فوراً مسکرا کر جواب دیا

”خوب شد سامان خود بینی شکست“

زبیب النساء بھی حمیدہ بانو بیگم کی طرح شادی کے معاملہ میں آزاد خیال رکھتی تھی۔ وہ اپنے جیسا ہم مذاق اور قابل آدمی کو رفیق حیات بنانا چاہتی تھی۔ عالمگیر کی طرف سے شہزادی کو شادی کے لیے مکمل آزادی تھی، یہ باتیں سب غلط ہیں کہ مغل شہزادیوں کی شادی نہیں کرتے تھے یا انھیں شادی کی اجازت نہیں تھی شہزادیوں کی شادی کے لیے تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

زبیب النساء کی عمر جب ۲۵ سال کی ہو گئی تو بیگمات نے عالمگیر سے کہا کہ شہزادی سیانی ہو گئی ہے اس کی شادی کر دیجیے، تو عالمگیر نے جواب دیا کہ ہم اپنی نور چشمی کی طینت اور طبیعت سے خوب واقف ہیں وہ کمزور طبیعت کی لڑکی نہیں ہے ہمیں اس کے بد راہ ہونے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ ہم اسے شادی کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔“ (بزم نیموریہ حصہ سوم)

جب بیگمات نے زبیب النساء بیگم کو شادی کرنے کے لیے مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ شادی کرے۔ ”زبیب النساء نے جواب دیا کہ لوگ مجھ سے نہیں سیر کرنا چاہتے اور میرے شہزادی ہونے سے شادی کرنا چاہتے ہیں، زبیب النساء سے نہیں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو محض زبیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ زبیب النساء کے اس جواب کو سن کر بیگمات لا جواب ہو گئیں۔

زبیب النساء شاہی محل کے پاس باغ میں ہر صبح و شام سیر کو جایا کرتی تھی۔

بیگم کو سیر و تفریح کے لیے اجازت تھی اسی وقت بہت سی حاجتمند عورتیں اپنی درخواستیں پیش کرتیں اسی وقت حاجتمند مرد بھی اپنی درخواستیں پیش کرتے تھے۔ درخواستوں پر ہمدردانہ غور کیا جاتا تھا اور جائز ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ زیب النساء اپنے بھائی بہنوں سے بے حد پیار و محبت کرتی تھی۔ جب شہزادہ اعظم شاہ بیمار ہوا تو زیب النساء نے ہی اس کی تیمارداری کی شہزادی وہی کھانا کھاتی جو بیمار شہزادہ کو ملتا تھا۔

زبیب النساء بڑی دیندار، پرہیزگار اور عبادت گزار اور عصمت مآب شہزادی تھی وہ خفی عقیدہ کو مانتی تھی۔ شہزادی سے متعلق بعض جاہلوں نے بہت سے غلط قصے مشہور کر رکھے ہیں ان قصوں کا مآخذ یورپین مصنفین کی تحریریں ہیں حقیقت میں یورپین مصنفوں نے کبھی اصلیت کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اصلیت کو پہچاننا تو ان کے لیے بہت ہی مشکل کام ہے ان خدا کے بندوں نے کچھ سنا غلط کچھ خود غلط حاشیہ آرائی کی۔ چونکہ انگریزوں کے طبقہ کی لائقینی اور لغو تحریرات کو دیکھتا ہے۔ اسی لیے ان پر ایمان رکھتا ہے یورپین مصنفین نے لکھا ہے کہ زیب النساء کو شادی نہیں کرنے دی گئی اس کی وجہ یہی تھی کہ تیموری بادشاہ شہزادیوں اپنی بیٹیوں کی شادیاں بہت کم کرتے تھے۔ کس قدر لغو دلیل ہے۔

ناصر علی، عاقل خاں، شیواجی سے متعلق زیب النساء کی محبت کے بے بنیاد افسانے جن کو میں تحریر کرنا بھی فضول سمجھتا ہوں۔ اس طرح پھیلانے کے لوگوں کو یقین آجائے مگر یہ سب افسانے من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔ ایسے افسانوں کا مقصد صرف شہزادوں شہزادیوں اور بادشاہوں کے کردار پر بدنامی داغ دکھانا تھا وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ شاہی محلات کے قریب جانے تک کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ تو عاقل خاں کس طرح محل کے اندر پہنچ گیا۔ وہ تیموری آئین سے ناواقف تھے۔ ان واقعات کا کسی بھی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا ہے محل کے قریب

غیر مرد تو کیا عورت بھی نہیں جاسکتی تھی۔

ڈاکٹر برنیر جس نے بہت سی بے بنیاد باتیں تحریر کی ہیں وہ دس ہیں :
 ”اپنے ذاتی تجربہ اور خواجہ سراؤں اور شاہی ملازمین کے ذریعہ حاصل معلومات
 کی بنا پر قلعہ کی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے کہ قلعہ کے دو حصے ہیں محل اور دوسرا
 محل سراے۔ محل سراے کا پتہ لگانا مشکل ہے، وہاں کسی شخص کا گزر ممکن نہیں۔
 ایک مثل مشہور ہے کہ تین موقعوں سے بچنا چاہیے اور احتیاط رکھنا چاہیے۔

(۱) کوئل گھوڑوں سے (۲) شکار گاہ سے (۳) محل سراے یا بیگمات شاہی
 کی سواری کے قریب جانے سے (سفرنامہ برنیر جلد دوم ص ۳۵-۱ اور ص ۳۷-۲)
 برنیر نے محل سراے کے بارے میں خواجہ سراؤں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ
 حسب مراتب بیگمات کے لیے علیحدہ علیحدہ محلات ہیں جن کے دروازوں کے
 سامنے حوض باغیچے روشیں قوارے لگے ہوئے ہیں دریا کی طرف ایک چھوٹا
 برج ہے جس کا رنگ لاجوردی ہے اور بڑے بڑے آئینے چاروں طرف لگے ہوئے
 ہیں۔ ایک مرتبہ برنیر کو بڑی بیگم کے علاج کے سلسلے میں محل سراے میں بلا یا گیا۔
 بیگم شدید علیل تھیں اور باہر کے دروازے تک آنا ممکن نہ تھا چنانچہ برنیر کو
 اندر لے جایا گیا۔ لیکن اس طرح کہ ایک کشمیری شال اس کے سر سے پاؤں تک
 ڈھک دی گئی اور ایک خواجہ سرا اندھے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر تک
 لے گیا۔ (بحوالہ تاریخی مقالات خلیق احمد نظامی ص ۱۸۷)

زیب النساء بیگم جیسی پاک دامن اور مقدس شہزادی سے ہندوستان کا
 بچہ بچہ واقف ہے اور اس کے علمی کارناموں کی گونج آج تک ہند کے درودیوار
 سے پیدا ہو رہی ہے مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ بازاری افواہوں اور گپ شپ
 تراشیوں کی بدولت بیگم کے دامن تقدس کو ہر قسم کے گناہوں سے ملوث کر دیا
 جبکہ بیگم کی زندگی کا ہر لمحہ خدا پرستی اور علم پروری میں بسر ہوا۔

ملا اشرف ایرانی نے بھی زیب النساء کو چودہ برس تعلیم دی۔ وطن واپسی پر اس نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھ کر بیگم کی خدمت میں پیش کیا، شہزادی نکتہ رس طبیعت کی مالک تھی وہ سیاسی شعور بھی رکھتی تھی۔ عالم گیر کی تاج پوشی کے وقت ایک بیش بہا تحفہ بادشاہ کو پیش کیا تھا بادشاہ نے شہزادی کو انعام کے طور پر چار لاکھ روپیہ عطا کیے۔ تخت نشینی کے وقت بھی زیب النساء کو زرو جو اہر عطا کیے۔ کشمیر میں بیگم آباد شہزادی کی جاگیر تھی — محمد اکبر زیب النساء کا سگا بھائی تھا۔ محمد اکبر کی بغاوت سے عالمگیر شہزادی سے خفا ہو گئے کیونکہ زیب النساء محمد اکبر کی طرف داری کر رہی تھی۔ بیگم نے کام بخش کی شادی آرام بانو بنت سعادت خاں صفوی سے کرائی اور زیب النساء کی ڈیوڑھی پر ہی بارات آئی جس میں عالمگیر اور بہت سے امراء نے شرکت کی۔

زیب النساء درویش مزاج کی شہزادی تھی بہت سادہ سفید لباس پہنتی تھی وہ خود لکھی ہے۔

” دختر شاہم ولیکن زولفقراوردہ ام

زیب وزینت لبس ہمیں است نام من زیب النساء است “

وہ بڑی نفاست اور نزاکت پسند تھی وہ سخی دل تھی اس کے دست کرم سے بہت سی غریب لڑکیوں، بیوہ اور یتیم بچے وظائف پاتے تھے شہزادی شریعت کی پابند تھی تمام عمر میں اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی وہ نوافل اور مستحب بھی بڑے والہانہ شوق سے ادا کرتی تھی بھائی بہنوں کا نام آتے ہی اس کے منہ سے محبت کا آب حیات ٹپکتا تھا۔ ایک طرف بیمار شہزادہ اعظم شاہ کی نیار داری کا خیال تو دوسری طرف، باغی محمد اکبر کو بھی بہت سے خطوط لکھے۔ جبکہ وہ راجپوتوں سے مل گیا تھا۔ روشن آرا بیگم زیب النساء کی بھوپنی کی وفات کے بعد زیب النساء کو سارے محلات کے کام سپرد کر دیے گئے عالمگیر زیب النساء سے سیاسی معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔

”زینت المساجد“ واقع دریا گنج جو گھٹا مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

اسی مسجد کے شمالی حصہ میں زیب النساء

بیگم کا مقبرہ ہے۔ شہزادی اس دنیا سے فانی سے سالکۃ میں رخصت ہو گئیں۔ عالمگیر کے آخری دور میں تمام ملک میں چاروں طرف بغاوت کھڑی ہو گئی اس دور میں بیگم کا اقبال بڑی بلندی پر تھا۔ بیگم سے عالمگیر کی ناراضگی جو شہزادہ محمد اکبر کی ناواقفیت، اور نا عاقبت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔

ایران، توران، عرب، ترکستان کے علماء و فضلاء بیگم کی شہرت سن کر

خود بخود ہندوستان کھنچے چلے آئے تھے۔ تفسیر کبیر کے ترجمہ نے زیب النساء کے نام کو جاوید بنا دیا۔ مولانا غلام علی بلگرامی ید بیضہ میں لکھتے ہیں کہ:

”زیب النساء نے اپنی ہمت کو ارباب فضل و کمال کی ترقی میں

صرف کر دیا۔ شاعروں، منشیوں اور خوشنویسوں کی ایک بڑی

جماعت اس کی قدردانی کے سایہ میں پرورش پا کر آسودگی

سے زندگی بسر کرتی تھی“

ایک بار نعمت خاں عالی جو بلند پایہ کا شاعر تھا اس نے ایک مرصع کلفی فروخت

کے لیے بیگم کے حضور میں پیش کیا کلفی کی قیمت ادا کرنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ نعمت خاں نے

فوراً ایک قطعہ لکھ کر بیگم کو بھیج دیا۔ بیگم نے پانچ ہزار روپے انعام اور بے کلفی بھی واپس

کر دی۔ ایک بار بیگم چاند کی چاندنی میں اپنی خواصوں کے ساتھ آبشار کا لطف اٹھا

رہی تھی فضا کی سکون اور منظر کی دلفریبی نے اس کے دل پر اثر کیا اور مندرجہ ذیل

اشعار بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑے۔

۱۱۶ مقالاتِ ثبلی ص ۱۱۶

”اے آبشار نوحہ گر از بہر چستی
چنین بر جبین فلندہ زانددہ کیستی

آیا چہ درد بود چوں من تمام شب
سر را نینسنگ میزنی دی گریستی

زیب النساء نے بہت سے باغات، سراہیں اور عمارات تعمیر کرائیں۔
بیگم کا مشہور باغ نواں کوٹ لاہور میں تھا۔ مگر آب آئنا مٹ رہے ہیں۔ یہ باغ
بہر طرح سے بہت ہی دلکش تھا۔ اس میں حمام، حوض، فوارے، آبشارے تھے اس
کی عمارت قیمتی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس باغ کو نمونہ بہشت بنایا گیا۔ چوہدری
والا باغ، کو بھی عالمگیر نے زیب النساء کو بخش دیا تھا۔

ڈاکٹر برنیر منوچی اور دیگر وہ مؤرخ جنہوں نے مہاراشٹر کے تاریخ کردہ
میں بیٹھ کر جو افسانے گھڑے وہ سب کے سب غلط اور بے بنیاد ہیں صمصام
الدولہ شاہنواز خاں نے اپنی کتاب مائتزالامراء میں شیعہ اور سنی تعصب میں مبتلا
ہو کر ہر قسم کے ناکردہ گناہ عالمگیر اور اس کی اولاد کے سر تھوپے ہیں مگر ایسے واقعات
کہیں نہیں ملتے۔ سر جادو ناٹھ سرکار نے تمام مرہٹی مآخذوں کو استعمال کیا۔ مگر کہیں
بھی یہ ذکر نہیں ملا کہ زیب النساء بیگم کی سازش سے شیواجی قلعہ سے نکل بھاگا
بہت سے غلط افسانے پروپیگنڈہ کے لیے جیسے جہاں آرا عصمت مآب کی طرح زیب النساء
عفت مآب کو بھی بدنام کرنے کے لیے تحریر کر دیے ہیں۔ غیر ملکی سفیر بالخصوص یورپ
کے مؤرخ نے ہندوستان میں مسلمانوں، شہنشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے
کردار کو اسی طرح کا سمجھا ہوگا جیسے ان کے حکمران طبقہ اور ان کی خواتین کے کردار
ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سفیر اور یورپ کے متعصب سفیر شہزادیوں کی تعلیم و تربیت اور
عملی زندگی ان کے کردار اور کارناموں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ دل ہی دل میں

بعض اور حسد رکھنے لگے پھر تعصب کے قلم سے ان کے کردار کے بارے میں بھی ایسے من گھڑت جھوٹے بے بنیاد افسانوں سے غلط پروپیگنڈہ کیا تاکہ مسلم پردہ نشین خواتین کے بارے میں دنیا والے اچھی رائے قائم نہ کر سکیں لیکن حقیقت پر پردہ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں تاریخی واقعات خود گواہی دیتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ان سفیروں اور یورپ کے مورخین نے خود اپنے سفر ناموں میں غلط باتیں تحریر کر کے ان کی اہمیت کو ختم کر دیا اور یورپ کے مورخین نے تو واقعات کو غلط تحریر ہی نہیں کیا بلکہ سمجھا بھی غلط ہے۔ یہی ان کی آنکھوں کا چشمہ ان کے تعصب کا اظہار ہے صلیبی جنگوں کی شکست کے بعد یورپ کے متعصب ادیبوں اور مورخوں نے اپنے تعصب کی لوک قلم سے تلوار کا کام لیا ہے۔

زینت النساء بیگم

”دختر ہند“ تصنیف میں مولانا محمد علیم الدین سالک زینت النساء بیگم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ :

”زینت النساء بیگم عالمگیر کی غیور اور خودار لڑکی تھی اس کے اخلاق حسنہ اور اطوار شستہ کے اثر سے بڑے بڑے امیر کا پتے تھے اور اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اس کے دامن تقدس پر فرشتے عبادت کرتے تھے۔ (ص ۲۲۴)

زینت النساء بیگم ۱۶ اکتوبر ۱۶۳۲ء کو دہلی میں بانو بیگم دختر شاہنواز کے بطن سے اورنگ آباد میں پیدا ہوئی زینت النساء بیگم اعظم شاہ کی حقیقی ہمیشہ اور اورنگ زیب کی چوتھی اولاد تھی عالمگیر نے اپنے تمام بچوں کی تعلیم و تربیت بڑے اعلیٰ پیمانہ پر دلائی وہ چاہتا تھا کہ میری اولاد اسلام کی پرستار ہو۔ اس لیے عالمگیر اپنی اولاد کے لیے اسلامی ماحول چاہتا تھا۔ زینت النساء اپنے والد کی خلف الصدق ثابت ہوئی زینت النساء بیگم کے معارف پروری اور علمی کارناموں سے ہندوستان کی فضا اب تک معطر ہے اور زیب التفاسیر کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

زینت النساء بیگم کا زیادہ تر وقت کلام پاک اور احادیث کے مطالعہ اور عبادت میں بسر ہوتا تھا اس کے زہد و القاد قابل احترام ہیں بچپن سے ہی اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا اور یہی ولولہ آخری دم تک رہا اسے علوم قرآنیہ پر کافی دسترس تھا۔ زینت النساء بھی جہاں آرا بیگم کی طرح ابا جان کی ہر وقت خاطر و مدارات کرتی رہتی تھی۔ عالمگیر کے بعد اعظم شاہ اپنے بھائی شاہ عالم سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اور شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس وقت زینت النساء بیگم، اعظم شاہ کی بیگمات اور بچوں کے ساتھ گوالیار کے قلعے میں تھیں۔ بادشاہ غنیمت ہی شاہ عالم نے حکم دیا کہ تمام بیگمات، زینت النساء بیگم اور اعظم شاہ کے بچوں کو فوراً گوالیار سے آگرہ لایا جائے۔ اعظم شاہ چوں کہ زینت النساء بیگم کا سگا بھائی تھا۔ اس کے قتل غم میں

بیگم مبتلا تھی، اسی لیے شاہ عالم کو بادشاہ بننے کی مبارک باد دینے کے لیے اس کے پاس نہ پہنچ سکیں۔ شاہ عالم خود زینت النساء بیگم کی خدمت میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا اور زینت النساء کو شاہ بیگم کا لقب عطا کیا، اور وظیفہ کی رقم دو گنی کر دی اس کے بعد بیگم آگرہ سے، دہلی چلی آئیں اور آخری دم تک یہیں رہی۔

شاہ عالم بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ بادشاہ بنا، مگر چند دن کے بعد ہی فرخ سیر نے جہاندار شاہ سے تخت حاصل کر لیا۔ جہاندار شاہ عیش و نشاط میں ڈوبا رہتا تھا۔ لال کنور جو اس کی چہتی بیوی تھی۔ اس کے زیر اثر اس نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لال کنور اہل نشاط سے تھی اپنی شوخی اور بے باکی سے جہاندار شاہ کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔ جہاندار شاہ نے لال کنور کو "امتیاز محل کا لقب عطا کیا۔ اس کا بھائی خوشحال خاں کو اکبر آباد کا صوبیدار بنایا گیا۔

زینت النساء بیگم اس ماحول کو دیکھ کر دل ہی دل میں گڑھتی رہتی تھی، جہاندار شاہ کو بھی بہت سمجھایا، مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا، زینت النساء بیگم نے لال کنور کو نہ کبھی بیگم تسلیم کیا نہ کبھی اسے عزت کی نظر سے دیکھا اور "دالستان دامن کو ہمیشہ حقیر و ذلیل سمجھا۔

فرخ سیر کا ابتدائی دور ہندوستان کی تاریخ کا خونین ورق ہے۔ فرخ سیر زینت النساء کا بڑا احترام کرتا اور ہر کام میں مشورہ لیا کرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں زینت النساء بیگم نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہر وقت اپنے کو عبادت میں مصروف کر لیا۔ سیاست اور دیگر کاموں سے بالکل علیحدہ رہنے لگیں ۸۰ برس کی عمر میں ۱۸ مئی ۱۷۲۱ء کو وفات پائی اور زینت النساء بیگم کو زینت المساجد کے ایک گوشے میں دفن کیا گیا، مگر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کو اس کی قبر کسی اور جگہ منتقل کر دی۔ زینت المساجد بیگم کی زندہ جاوید یادگار ہے یہ مسجد شاہ جہاں آباد (دہلی) میں بہت مشہور ہے اور دریا گنج میں ایک بلند چوڑے پر واقع ہے اس کے مینار دور سے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ کے پتھروں سے بنی ہے۔ چھت سادہ اور تینوں گمبذ سنگ مرمر کے بنے ہیں جن میں سنگ موسیٰ کی دھاریاں ہیں۔ مسجد کے سات درہیں ایک خوشنما حوض ہے مسجد کے صحن میں ہی بیگم کا مزار ہے۔

جو رقم عالمگیر نے نقدی کی شکل میں زینت النساء بیگم کو ہمیز میں دی تھی بیگم نے وہ سب رقم اسی مسجد کی تعمیر میں خرچ کر دی۔ قبر کے پاس ایک چھوٹا سا برج تھا، قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا تھا۔ قبر کے سرہانے آیتہ کریمہ "قل یا عبادی الذین" کے بعد یہ کتبہ منقوش تھا۔

مونس مادر بچہ فضل خدا تنہا بس است
سایہ ازا بر رحمت قبر پوشش مابس است

امید وار حسن خاتمہ قائمہ زینت النساء بیگم بنت شاہ محی الدین عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ۱۱۲۲ھ
مگر آج وہاں کچھ بھی نہیں۔ مسجد نمازیوں کے لیے محتاج ہے۔

اورنگ زیب کی دوسری بیٹیوں میں زینت النساء کے بعد بقول عالمگیری کہ:
"زینت النساء نے کبھی باپ کی توجہ سے فیض تربیت سے علمی کمالات حاصل
کیے وہ احکامی دینی اور مسائل شرعی سے بخوبی واقف و آگاہ تھی۔"

صبح گلشن میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک شاعرہ کے لیے کیا گیا ہے۔ مؤلف کے الفاظ ملاحظہ ہوں:
"زینت النساء ہمیشہ زیب النساء بیگم از بنات اورنگ عالمگیر بادشاہ است
عالمہ و شاعرہ و حافظہ کلام اللہ بود زینت المساجد بنا کردہ اس الی الان
در شہر شاہجہاں باوجود و معمور و بر رنگ مزارش کہ در صحن ہمایوں
مسجد است این شعر خود کش منقوش و منقول۔"

شعر پیچھے تحریر کیا جا چکا ہے۔

اورنگ زیب کی بیٹی بدر النساء بیگم اور زبیدۃ النساء بیگم نے ہمیشہ طاعت و عبادت
و عقیل علم میں عمر بسر کی اور ذخیرۃ سعادت فراہم کرتی رہیں وہ حافظ قرآن اور علم دین سے
مالا مال تھیں، انھوں نے علم کے ساتھ عمل کو بھی محفوظ رکھا۔

"ہندوستان کے شاہان مغلیہ کی بیویاں اور ہندو رانیوں کے مصنف نے اس کتاب
کے صفحہ نمبر ۶ پر تحریر کیا ہے کہ زینت النساء کی شادی اورنگ شاہ ولی ترکستان سے ہوتی تھی۔"

۱۱۲۲ھ ۳۹۰ھ مرزا محمد بیگم کی وفات ۲۲ رجب ۱۱۲۲ھ لاہور میں ہوئی۔ یکم شعبان ۱۱۲۲ھ

نورجہاں بیگم

”نگہ بند سخنِ دل نواز جاں پر سوز نہ یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے“

عورت کا عزم اور ارادے کے مقابلے میں جرحی سپاہیوں کی دلیری فوجوں کی کثرت توپوں، دآتش بازی کی گرج، شمشیر و ثنا کی جھنکار، گھوڑوں کے ٹاپوں کی خوفناک آواز اور شاہانہ جاہ و جلال کچھ حقیقت نہیں رکھتے بھارت کی غیر فانی ہستیوں میں نورجہاں کا نام ہمیشہ ممتاز نظر آئے گا اس کی قربانی اور نخلصانہ کارنامے ہندوستان کے دل پر زمینِ حروف سے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ عورت کے نازک بازو اور کمزور ہاتھ شیرخوار بچوں کا پنکھوڑہ ہلایا کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہی ہاتھ قوموں، سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ بھی کیا کرتے ہیں۔

نورجہاں تیموری خاندان کا چشم و چراغ تو نہ تھی مگر تیموری شہنشاہ جہاں گیر کی شریکِ حیات بن کر حرم اور حکومت کے لیے زیب و زینت بنی۔ اگر بیگم نورجہاں کا مغل شہزادیوں کے ساتھ تذکرہ نہ کیا گیا تو نا انصافی ہوگی اور یہ کتاب بھی نامکمل ہوگی اور یہ تاریخ کی بڑی بھول سمجھی جائے گی۔ نورجہاں کی سرگرمی کردار و عمل کی تصویر میں بہت سے پہلو شامل تھے۔

خواجہ غیاث بیگ، مغربی تاتار (تہران) کے ایک معقول تعلیم یافتہ اعلیٰ خاندان کا شخص تھا جس نے اپنی ہی جیسی ایک شریف عورت سے شادی کی اور انتہائی عسرت کی حالت میں اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ (غیاث بیگ کے) والد کا نام خواجہ محمد شریف تھا۔ خواجہ محمد شریف پہلے خراسان کے صوبے دار محمد خاں کتلوکا وزیر تھا۔ محمد خاں کتلوکا کی وفات کے بعد شاہ تہما سپ صفوی کے یہاں خواجہ محمد شریف نے ملازمت کر لی۔ جہاں اسے یزد کی وزارت حاصل ہوئی خواجہ شریف کے دو بیٹے تھے۔

(۲) مرزا غیاث

(۱) آقا طاہر

۱۵۷ء میں خواجہ محمد شریف کا انتقال ہو گیا۔ تو مرزا غیاث نے ہندوستان کا رخ کیا۔ جب مرزا غیاث قندھار آیا تو اس مصیبت کی گھڑی اور سفر کی حالت میں مہر النساء (نور جہاں) کی ولادت ہوئی اس مصیبت کی گھڑی میں بیٹی کی حالت بہت ہی گراں گزر رہی تھی۔ مگر سچی قسمت کہ مرزا غیاث ہندوستان پہنچ کر فتح پور میں اکبر کی خدمت میں پیش ہوا۔ مرزا غیاث اپنے زمانہ کا مشہور شاعر، ادیب، عالم ذہین، سخی طبیعت اور رحم دل انسان تھا۔

نور جہاں ایک علم پرور باپ کی بیٹی اور اعلیٰ مصوٰر اعلیٰ شاعر اعلیٰ ادیب و انشا پرداز کی شریکِ حیات تھی، اس طرح باپ کی وراثت اور شوہر کی رفاقت سے اس کی علمی شعور اور لیاقت و صلاحیت کو اتنی جلا ملی کہ اب تک اس کی استعدادِ علمی اور سخن سنجی کی داد دی جاتی ہے، اپنے والد کی طرح نور جہاں بھی دل کی فیاض تھی فیشن کی دلدادہ تھی شوہر پرستی کی خوبی قابلِ تعریف تھی۔ اپنے اقتدار کے بعد نور جہاں نے مذہبی زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی سیرت سے یہ بالکل ہم آہنگ تھا کہ وہ سخت جاہ طلب تھی۔ وہ ان مستحکم پسند و ناپسند افراد میں تھی جو اپنی قوت کے سرمایہ سے آگاہ ہوتے ہیں، علمی استعداد بھی نور جہاں میں بے پناہ تھی۔ اس میں حیرت انگیز محنت کرنے اور محنت کرانے کی صلاحیت تھی جو کام کرتی وہ محنت اور دل سے کرتی اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتی تھی۔ اس کی حسن تدبیر اور حاضر دماغی خطرہ کے وقت بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ کئی بار اس کی زندگی خطرہ میں آئی مگر دانشمندی سے کام لیا۔ اور اس نے اپنے حسن کی شادابی کو بدستور قائم رکھا، قدرت کی عطا کردہ رعنائی اس میں مفقود نہ تھی، ایران کے بے بہا حسن کی زیبائی اور خدو خال کی مزاجی اور اعلیٰ دلکشی نے اور چمکادیا تھا مصوٰروں نے اس کے خدو خال کی رعنائی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے ہیں اور اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی ہیں۔ نور جہاں کا نام آتے ہی ایک نازک بیضاوی چہرہ کشادہ پیشانی، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں اور باریک لب نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی صحت ہمیشہ اچھی تھی وہ گھوڑے پر سوار حکومت اور تلکار کرتی تھی اور مضبوط ہاتھ سے نشانہ لگاتی تھی۔ (تاریخ جہانگیری ص ۱۸۶-۱۸۵)

علی قلی بیگ جو شاہی دربار کا ملازم تھا اکبر نے مہر النساء سے شادی کرادی جہانگیر کے عہد میں علی قلی بیگ کو اعلیٰ منصب اور شیرانگن کا خطاب عطا کیا گیا اور اسے بنگال کی جاگیر بھی عنایت کر دی گئی۔ مگر جب شیرانگن نے جہانگیر کے خلاف بغاوت علم بلند کیا تو بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے قطب الدین کو بنگال بھیجا مقابلہ میں قطب الدین کے ذریعہ شیرانگن کا قتل ہو گیا۔ شوہر کے قتل کے بعد نور جہاں جہانگیر کے دربار میں واپس آگئی اور اپنی والدہ کے پاس رہنے لگی، اس وقت مرزا غیاث کو اعتماد الدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔

۱۶۱۱ء میں خوش نصیب مہر النساء کی شادی جہانگیر سے ہوئی، بیگمات اور شاہی محل اور جہانگیر کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ مہر النساء کو جولائی ۱۶۱۱ء میں نور محل اور مارچ ۱۶۱۶ء میں نور جہاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سرٹامسرو کا بیان ہے: ”جہانگیر جو معتدل اور سادہ لوح انسان ہے نور جہاں سے شادی کر کے اس کی محبت کا قیدی ہو گیا۔ اب وہ ایک کان سنتا ہے۔“

ٹیری کا بیان ہے کہ نور جہاں نے اپنی محبت سے اتنی فتح حاصل کر لی کہ جہاں گیر کی محبت پر تقریباً پورا قبضہ کر لیا وہ مملکت میں جو چاہتی تھی کرتی تھی چنانچہ اس نے اپنے بھائی آصف خاں اور دوسرے قریبی عزیزوں کو اقتدار و عزت اور منافع کے بلند ترین درجوں تک سلطنت میں پہنچا دیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ڈاکٹر برنیر کا بیان ہے کہ :

”جہانگیر کی ملکہ (نور جہاں) نے بہت دنوں تک ملک پر حکمرانی کی“

تمام مبصرین ملکی اور غیر ملکی بالاتفاق راوی ہیں کہ نور جہاں کی سلطنت پر پوری حکمرانی بے وجہ کبھی جھروکہ میں بیٹھی تھی حکام کو احکام نافذ کرتی تھی اور سفیروں کی پزیرائی کرتی تھی کبھی سکوت پر اس کا نام ہوتا تھا اور اکثر فرامین اس کے نام سے جاری ہوتے تھے، اگر وہ منصب داری کے زمرہ میں

۱۔ اقبال نامہ ص ۵۷-۵۸ ایٹ وڈاؤسن ج ششم ص ۵۰۵ تمتہ وقائع جہانگیری ایٹ وڈاؤسن

ص ۳۹۹-۳۹۸۔ مآثر جہانگیری ر مخلوط خدا بخش ص ۷۶-۷۷،

۲۔ بحوالہ تاریخ جہانگیر ص ۱۹۵۔

شامل ہو سکتی تو اپنی جاگیروں کے لحاظ سے تیس ہزار کے منصب پر ہوتی اس کی سرپرستی کا انحصار اس کے رفیقوں پر تھا۔^۱

معتد خاں کا بیان ہے کہ سارے سکوتوں پر نور جہاں کا نام ہوتا تھا اور سارے فرامین اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیوں کہ لہین پول و ہاٹرٹ و ہڈنے سکوتوں کی جو فہرست مرتب کی ہے، ان میں سے بہت سے سکوتوں پر نور جہاں کا نام نہیں ہے اس کے نام سے جو سکوتے مضروب ہوئے ان پر یہ لکھا تھا کہ حکم شاہ جہانگیر یافت صدر پور، بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر۔^۲

محمد ہادی الیٹ و ڈاؤسن اور اقبال نامہ کے مصنفین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نور جہاں تمام مصیبت زدہ افراد اور بے یار و مددگار لڑکیوں کی پناہ گاہ تھی۔ کسی مظلوم کا حال سن کر اس کی مدد کرتی تھی ہر یتیم لڑکی کی شادی کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتی تھی اس نے اپنے زمانے میں آٹھ سو لڑکیوں کی شادی کرائی اور دیگر ضرورتوں اور اخراجات جہیز کی تعداد بے شمار تھی۔ نور جہاں حسین ہونے کے ساتھ بے پناہ ذہین بھی تھی نظام سلطنت کے مسائل کو ذریعہ حل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی شہنشاہ نے خطاب باٹنے کا کام بھی نور جہاں کے سپرد کر دیا تھا۔ سلطنت کے سبھی واقعات نور جہاں کے گرد گردش کرنے لگے۔

نور جہاں کا جہانگیر سے شادی اور اس کا ملکہ بن جانا جہانگیر کی زندگی کا ایک اہم دلچسپ اور تاریخی واقعہ مانا جاتا ہے۔ اس شادی کے بارے میں مؤرخین کی مختلف رائے ہے۔ ڈی۔ لٹ کا بیان ہے کہ جب مہر النساء کنواری تھی تب ہی سے جہانگیر اس پر عاشق تھا لیکن اکبر کی جیات میں ہی مہر النساء کی سرگائی شیر افگن سے ہو گئی اور اکبر نے جہاںگیر کو شادی کی

^۱ اقبال نامہ ص ۵۷-۵۶، الیٹ و ڈاؤسن ج ۵ ششم ص ۵۷-۵۸، تمتہ و قانع جہانگیری الیٹ

و ڈاؤسن ص ۳۹۹-۳۹۸۔ مآثر جہانگیری (مخطوطہ خدابخش ص ۷۶-۷۷،

^۲ بحوالہ تاریخ جہانگیر ص ۱۹۵

اجازت نہیں دی لیکن عشق چلتا رہا۔

- ۱۔ صرف شبہ کے الزام میں قطب الدین سے شیر افگن کو قتل کی سزا دلانا جہانگیر کے لیے مناسب نہیں تھا جبکہ شیر افگن کو اس کی ناراضگی کا سبب تک نہیں بتایا گیا۔
- ۲۔ جہانگیر کی ناراضگی صاف عیاں ہے کہ اسے بذاتِ خود اس واقع کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ اس شادی کے اہم واقع کے بارے میں جہانگیر کیوں خاموش ہے یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے خیالات کے برخلاف ڈاکٹر بینی برسا نے بڑی قابلیت اور اس زمانہ کے مورخین کے مطالعے کے بعد جہانگیر اور نور جہاں کے عشق کی جھوٹی داستانوں اور افسانوں کو بے نقاب کر دیا اور سچائی کے ساتھ تحریر کیا کہ اصلی تاریخ یہ ہے کہ :-

- ۱۔ عہدِ جہانگیری کے کسی بھی مورخ نے یہ الزام نہیں لگایا کہ جہانگیر نور جہاں پر عاشق تھا۔
- ۲۔ شاہجہاں کے عہد کے مورخین جو نور جہاں سے حسد بھی رکھتے تھے کسی نے بھی نور جہاں اور جہانگیر کے عشق کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

۳۔ اس زمانے کے یورپ کے مورخین نے بھی جہانگیر کو مجرم قرار نہیں دیا ہے۔

- ۴۔ اگر جہانگیر نور جہاں پر شادی کے پہلے سے ہی عاشق ہوتا تو علی قلی (شیر افگن) کو نور جہاں سے سگائی کے بعد ملازمت سے الگ کر دیتا اور اپنے رقیب کے عہدہ کو بھی بلند نہیں کرتا۔

- ۵۔ نور جہاں کے کردار کی پاکیزگی بتاتی ہے کہ اسے اپنے شوہر کے قاتل کے سامنے کبھی بھی تسلیمِ خم نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نور جہاں جہانگیر سے بے حد انسیت رکھتی تھی آخر میں پوری بحث کے بعد ڈاکٹر ایشوری پرشار بھی اسی نتیجہ پر آتے ہیں کہ جہانگیر کے بارے میں کوئی بھی مستند ثبوت نہیں ملتا جس سے اسے شیر افگن کے قتل میں ملزم قرار دیا جاسکے۔
- جب نور جہاں نے سلطنت کا کام سنبھالا اس وقت اس کے عہد سے صرف خرم کا عہدہ بلند تھا۔ نور جہاں کا بھائی اصف فاں اس زمانے کا معروف ادیب اور عالم تھا۔

بقول ڈاکٹر بینی پرشاد کہ "فائنیس کے معاملے میں آصف خاں کے مقابلہ کا پوری سلطنت

میں دوسرا نہیں تھا"

جب ۱۶۲۲ء میں آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو کی شادی خرم سے ہو گئی تو اس شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب شہزادہ خرم، آصف خاں اعتماد الدولہ اور نور جہاں کی پارٹی بہت ہی منظم اور مستحکم ہو گئی اور دس سال تک ملک کی سیاست پر ہر طرف اسی گروہ کا اثر دکھائی دیتا ہے مکمل اقتدار کے ساتھ انھیں چاروں نے حکمرانی کی۔ اس زمانے کے مورخین نے اس دور کو "نور جہاں کے زمانے کے نام سے تاریخ میں تحریر کیا ہے :

"مرزاغیاث کو اعتماد الدولہ کا خطاب بھی نور جہاں کی بدولت ملا"

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نور جہاں کے دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

(۱) ۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۲ء تک اس دور میں نور جہاں کے والدین حیات تھے وہ ہر طرح سے

نور جہاں کے کاموں پر نگہداشت رکھتے تھے اس دور میں شہزادہ خرم نور جہاں کے ساتھ تھا۔

دوسرا دور ۱۶۲۲ء سے ۱۶۲۷ء تک چلتا ہے اس دور میں جہانگیر کی صحت خراب ہو چکی

تھی اس کی کوئی طاقت یا حیثیت نہیں رہی تھی۔ یہ زمانہ دربار میں گروہ بندی کا زمانہ کہلاتا ہے۔

دربار دو گروہ میں تقسیم تھا اس دور میں شہزادہ خرم نور جہاں سے خلاف ہو گیا کیوں کہ نور جہاں نے

اپنی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افکن سے پیدا تھی اس کی شادی شہریار سے کر دی تھی اور نور جہاں شہریار کو

تخت کا وارث بنانے کی سازشوں کے تانے بانے بن رہی تھی مگر شہریار جو نہایت نا اہل، کاہل اور

عیش پرست تھا اس کو تخت و تاج کی کوئی پرواہ تھی نہ اپنے کو اس کا اہل سمجھتا تھا اور۔ اس وقت

شہریار دار الخلافہ سے بہت دور تھا۔ تمام ملک میں سوزش برپا تھی۔ نور جہاں کے بے جا اثر سے مہابت خاں

جو اس دور کا مشہور امیر تھا خلاف ہو گیا اور خرم کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ عبدالرحیم خاں خان خاناں

نور جہاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اچانک جہانگیر کا ۲۹ اکتوبر بروز اتوار ۱۶۲۷ء کو بمقام

راجوڑی میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت دربار کے حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے، بادشاہ کی

موت کے بعد تخت نشینی کا مسئلہ درپیش تھا۔ نور جہاں کو اس نازک وقت کا اندیشہ تھا اسی لیے

وہ جان توڑ کر کوشش کر رہی تھی کہ اس کا اقتدار قائم رہے سخت مزاجی کی وجہ سے بھی وہ خرم کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ شہریار کے مزاج میں لچک بھی تھی اور بانچپن بھی شہریار کے پاس نورجہاں نے لڑائی کی تیاری کے لیے ایک قاصد بھیجا دوسری طرف وہ اپنے بھائی اصف خاں کو بھی گرفتار کرنا چاہتی تھی اصف خاں جو بہت ہی دور اندیش اور دانشور تھا خرم کو بادشاہ بنانے کی فکر میں لگ گیا۔ ملک میں سورشش، مخالفت اور بغاوت کے اسباب خاندانی گروہ بندی باہمی مخالفت، حسد، نورجہاں کا بے جا اثر اپنے لوگوں سے خالی عہد کو بھرنا اور خقدار اور لائق امراء کو دربار سے الگ کر دینا تھا۔

جب خرم کی شادی ۶۱۲ء میں ارجمند بانو سے ہو گئی تو حالات بالکل ہی بدل گئے خرم کی پرورش اس کی دادی رقیہ بیگم نے کی تھی اکبر خرم کو بہت لاڈ پیار کرتا تھا اکبر نے خرم کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی اور اس کے لیے اتالیق مقرر کیے۔

(۱) تاتاریک کو ترک زبان (۲) یونانی فلسفہ کے لیے حکیم دوانی گیلانی (۳) مذہبی اور غیر علوم کے لیے استاد قاسم بیگ تبریزی (۴) شیخ مبارک کے شاگرد ابوالخیر نے تیر اندازی اور شمشیر زنی کے لیے میر مراد دکنی اور راجہ شمالی باہن نے ذمہ داری لی۔

شہزادہ ہمیشہ اپنے اساتذہ بالخصوص حکیم دوانی کے احسانات کا بہت اعتراف کرتا تھا لیکن زندگی میں کامیابی اس کی اخلاقی قوت اور کردار کی بلندی سے ہوئی جو اسے اپنے دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔

شہزادہ خرم پر ہیزگاری کی تصویر تھا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور انکساری ٹپکتی تھی۔ وہ شان و شکوہ اور طمطراق کا بڑا دلدادہ تھا۔ جہانگیر خود اس کی بارات لے کر اصف خاں کے گھر گیا تھا اور ایک دن اور ایک رات وہاں قیام کیا۔ ارجمند بانو بیگم بھی بہت ہی منہس نکھ تھی کبھی آؤ گی اس کے چہرہ سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ نورجہاں کو قدرت نے حکمرانی کی پوری صلاحیت عطا کی تھی۔

۱۔ محمد قزوینی، بادشاہ نامہ

تاریخ شاہد ہے کہ نور جہاں ایک اعلیٰ ادیبہ اور اعلیٰ شاعرہ تھی اور وہ شعراء کی سرپرستی بھی کرتی تھی اپنی سگی بہن پنچہ بیگم کے شوہر نواب قاسم خاں کی بحیثیت ایک شاعر بہت قدر دانتی اور اس کی ہر طرح سرپرستی کرتی تھی۔ نور جہاں نے بہت سے شعراء کو دربار میں متعرف کرایا اور بہت سی عورتیں جو شاعری میں شغف رکھتی تھیں وہ نور جہاں کی دسترس میں تھیں۔ اس زمانہ میں مہر ہروی بدیہہ گوئی کی معروف شاعرہ تھی اس کی صلاحیت کی نور جہاں نے خود تعریف کی ہے۔ نور جہاں نے مہر ہروی کو بھی انعام و اکرام سے نوازہ دکھایا۔

مہر ہروی کی ایک غزل ملاحظہ ہو :

حل ہر نکتہ کہ ہر چیز خرد شکل بود آزمودیم بیک قطرہ ے حاصل بود
گفتم از مدرسہ پریم سبب حرت ے دوہر کس کہ ز دم بے خود دلا العقل بود
خواستم سوز دل خویش بگویم باشع داشت او خود بنمایاں آنچہ مراد دل بود
درچین صبح دم از گریہ وزاری من لالہ سوختہ خوں در دل و پا در گل بود
آنچہ از بابل و باروت روایت کردند نسحر چشم تو بدیدم ہمہ را شامل بود
دوئے بود تماشا ئے راخت مہر را حیف و صد حیف کہ ایں دولت مستعجل بود

”مرآۃ الخیال کا مولف نور جہاں کی سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر خوانی کی تعریف کرتا ہے نور جہاں کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کی تصدیق ماثرا لامرا اور منتخب اللباب سے بھی ہوتی ہے نور جہاں کی حاضر جوابی کے لطیفے آج تک علمی مجلسوں میں مشہور ہیں۔ شاہی حرم میں داخل ہوتے ہی نور جہاں نے اپنے جمالیاتی ذوق سے حرم کی عورتوں کا سارا مذاق ہی تبدیل کر دیا۔ بناؤ سنگار، زیورات لباس پوشاک فرش و فرش اور زیور و عیش و عشرت و آرائش میں اتنی جدتیں پیدا کیں کہ پورے ہندوستان پر یہی رنگ غالب آگیا۔ عطر بھی نور جہاں کی کلفشانی ہے۔ جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں کی جہانگیری کا دن بے نور ہو گیا۔

۱۔ مرآۃ الخیال ص ۵۳۳

حقیقت میں نور جہاں فیشن کی ملکہ تھی اسی کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس کو علم و ادب کی دولت سے مالا مال کیا تھا، نور جہاں بدیہہ گوئی شاعری میں اپنے عہد کی خود ہی مثال تھی ایک دن جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ ”لعل بے بہا“ کا تھا۔ نور جہاں کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی فوراً مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

”ترانہ تکمہ لعل است برقبائے حریر
شده است قطره خون منت گریباں گیر“
ایک بار جہانگیر نے عید کا چاند دیکھ کر یہ مصرعہ موزوں کیا :
بلال عید براوج فلک ہویدا شد
فوراً نور جہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ پڑھا :
کلید یکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

نور جہاں کی بدیہہ گوئی کی مثالیں مفتاح التواریخ مولف ”سرتامس ولیم ہیل میں بھی ملتی ہیں۔
ایک بار نور جہاں نے کئی دن بعد جہانگیر کو دیکھا تو خوشی سے نور جہاں کی آنکھوں سے
بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ جہانگیر نے اس کیفیت کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نور جہاں نے فوراً ہی فی البدیہہ مصرعہ موزوں کیا۔

آبے کہ ہے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ماہ محرم ۱۰۲۸ھ میں ایک دم دارستارہ لظا آیا نور جہاں نے اسے دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا۔

”ستارہ نیست بدیں طول سے بر آوردہ فلک بشالای شہ کہ بر آوردہ“

”یہ سب روایتیں صرف مفتاح التواریخ میں تھیں کہیں کسی دوسرے تذکروں میں نہیں ملتی“

تیموری خاندان کی جو بھی شہزادی شاعری کرتی تھی وہ اپنا تخلص خفی رکھتی تھی یہ بات
قابل غور اور حیرت انگیز ہے۔

۱۔ بحوالہ بزم تیموریہ ص ۲۵۰

یہ بات مراۃ الخیاں اور منتخب الیاب کے مؤلفین نے کہی ہے۔ مآثر الامراء کا مؤلف بھی یہی بات تحریر کرتا ہے کہ نور جہاں کا تخلص مخفی تھا۔

یہی مؤلف نور جہاں کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتا ہے۔

”دل بصورت ندیم ناشدہ است معلوم = بندہ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم“

زاد ہول قیامت منگن درد دل ما ہول ہجران گذران ندیم قیامت معلوم

(رج اول ص ۱۲۴)

مفتاح التواریخ میں اس طرح نقل ہے۔

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است کلید قفل دل ما نسیم یار است

نہ گل شناسد و نہ رنگ و بود نہ عارض و زلف دل کے بحسن دادا گرفتار است

مندرجہ ذیل شعر کو مفتاح التواریخ کا مؤلف نور جہاں کا بتاتا ہے جبکہ کسی دوسرے نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

نور جہاں گرچہ بصورت زن است در صف مرداں زن شیر افگن است

خاں احمد حسین خاں نے اپنی تصنیف ”رانیوں اور شہزادیاں“ میں تحریر کیا ہے کہ

جب نور جہاں اور جہانگیر کی محبت کا نور جہاں کی والدہ کو علم ہوا تو نور جہاں کی والدہ نے بیٹی کو

شاہی محل میں لے جانے سے روک دیا اس کا جب اکبر کو علم ہوا تو اکبر نے سلیم کو نصیحت کی

کہ بیٹا بادشاہوں پر واجب کہ ملازموں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹیاں سمجھیں اگر ہم ایسی باتیں

کریں گے تو دنیا میں آج ہی قیامت آجائے گی۔ تمہیں بھی ایک دن بادشاہ ہونا ہے۔ خبردار ایسا

پھر کبھی خیال نہ کرنا۔ (جلد اول ص ۱۳۴) اس کے بعد مہر النساء کی شادی شیر افگن سے کر دی

شیر افگن کے انتقال کے بعد جہانگیر نے اس کو ہر شب چراغ کے پاس ایک بی بی کو شادی کا پیغام بیکر

بھیجا یہ بات سن کر مہر النساء کے آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ غیور خاتون بولی کہ شیر افگن جیسے خاوند کو گناہ کر دوسرے

کا منہ دیکھنا ننگ و وفا منہ کالا کرنا ہے بی بی تم جا کر میری طرف سے حضور میں عرض کروں کہ خیر جہاں پناہ اس نصیب

بد جو کچھ گزر گئی اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا مگر بیوہ و بے کس پر رحم کرو۔ نور جہاں کے اس جواب کی سب سے تعریف کی ہے۔

ممتاز محل

ارجمند بانو بیگم نورجہاں کی بھتیجی (آصف خاں) کی دختر بلند اختر تھی جس کی ولادت ۹ رجب ۱۵۹۱ء کوئی شادی کے وقت ارجمند بانو بیگم کی عمر ۱۹ سال ۸ ماہ نو دن کی تھی۔ شہزادہ خرم شاہ جہاں سے شادی کے بعد ارجمند بانو بیگم کو پہلے تو عالیہ بیگم بعد میں نور محل اور ممتاز محل کا لقب عطا کیا گیا اور یہی شاہ جہاں کی سب سے زیادہ چہتی اور محبوب بیوی بنی۔

قدرت نے اس پری زادی کو تعلیم و تربیت کے ساتھ حسن و جمال سے مالا مال تھا۔ ارجمند بانو بذات خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنی پھوپھی نورجہاں کی طرح علم و فضل سے خود بھی آراستہ تھی۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی۔ اس میں شعر کہنے کی صلاحیت اور بدیہہ شعر کہنے کی بے پناہ لیاقت موجود تھی۔ اس کا اندازہ ہم اس واقع سے لگا سکتے ہیں جب ایک بار شاہ جہاں جہان کے کنارے بیٹھ کر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا تو شاہ جہاں نے موجوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ممتاز بیگم سے کہا :

”آب از برائے ویدنت می آید از فرسنگہا“

اس پر ممتاز نے فوراً مصرعہ موزوں کر کے جواب دیا :

”از بینیت شاہ جہاں مری زندہ برسنگہا“

یہ روایتیں صرف اردو کی کتابوں میں تو ملتی ہیں مگر فارسی اور انگریزی کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ بیگم کی زندگی کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب نورجہاں کی سیاسی خوشحالی اور جاہ پسندی کی وجہ سے ہندوستان کا امن و امان ختم ہوتا نظر آتا ہے اور چاروں طرف فسادے شعلے بھڑکنے شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے کہ آصف خاں کو نورجہاں کی بدولت ہی شاہی دربار میں عزت ملی تھی خسرو اور خرم نورجہاں سے ناخوش رہتے تھے۔ جہانگیر شہزادہ پرویز کو سلطنت کا

وارث بنانا چاہتا تھا۔ مگر وہ عیش و نشاط میں غرق تھا اور حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ شہریار نورجہاں کے ہاتھ کی کٹ پتلی تھا۔ نورجہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کر دی اور ۱۰۳۱ھ میں خسرو کا انتقال ہو گیا۔ خسرو کے انتقال کے بعد نورجہاں کو اپنی دیرینہ خواہش یعنی شہریار کو سلطنت کا ولی عہد بنانے کا موقع نظر آنے لگا۔ نورجہاں نے خرم کو قندھار مہم پر بھیجنے کا حکم دیا اور مہابت خاں کو کابل سے واپس بلایا جہاں نگر اس مہم کو ٹالنا چاہتا تھا کیوں کہ حالات سازگار نہیں تھے اور یہی انتظار کیا جا رہا تھا کہ پہلے قندھار کے حالات کا جائزہ لیا جائے اور پھر جنگ شروع کی جائے مگر نورجہاں چاہتی تھی کہ خرم کو کسی طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑے۔ خرم نے نورجہاں کی اس چال کو سمجھ کر ۱۰۳۲ھ کو — بغاوت شروع کر دی۔ اس بغاوت کے وقت ممتاز خرم کے ساتھ رہی اور ہر طرح مدد کرتی رہی آخر خرم اپنی کوششوں کا میاب ہوا اور ۱۰۳۳ھ کو بادشاہ بن گیا۔ تخت نشینی کے بعد خرم کو شاہجہاں کا لقب حاصل ہوا۔ شاہجہاں کا پورا نام شہاب الدین محمد شاہجہاں تھا۔ تخت نشینی کی خوشی میں شاہجہاں نے ممتاز محل کو دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ عطا کیے۔ اور محل کی مہرداری کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔

بیگم ممتاز محل کا تیسرا دور ۱۰۳۴ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت شہنشاہ دکن کی مہم پر تھا اسی دوران بیگم دروزہ میں مبتلا تھی۔ عبدالحمید لاہوری اور ملا صالح کا بیان ہے کہ بیگم بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی بیگم کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ بادشاہ فوراً دکن سے آیا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بیگم بچوں کو وصیت کرتی ہوئی دارفانی سے رخصت ہو گئی۔ نعش امانت بطور پہلے دین آباد کے باغ میں دریائے تپتی کے کنارے سپرد خاک کی گئی۔ اب شاہجہاں کا بڑھا پاشروع ہو گیا۔ اب لذت سلطانی ہی نہیں بلکہ زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ وہ حرم میں جاتا مگر اسی وقت روتا ہوا واپس آ جاتا اور کہتا کہ اب کسی کی صورت دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوتی بیگم کی موت کے بعد ایک ہفتہ تک دربار نہیں کیا وہ چاہتا تھا کہ پوری سلطنت کو چاروں بیٹوں میں تقسیم کر کے فقیر بن جاؤں اور مجاور بن کر بیگم کی تربت پر بیٹھ جائے۔ اکثر شاہجہاں کو امراء سے

کہتے ہوئے سنا کہ اگر سلطنت کا بوجھ میرے کندھوں پر اور رعایا کی پاسداری کا خیال میرے دل میں نہ ہوتا اور شریعت ترک دنیا کی اجازت۔ دینی تو یقیناً فقیر بن جاتا۔ دو سال تک ہر آرام، قیمتی لباس جو اہرات درباری زیورات پہنتے چھوڑ دیے ہر راگ رنگ ترک کر دیا۔ عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ بیگمات کے جھڑمٹ میں ممتاز کی صورت نہ دیکھتا تو بے اختیار رو پڑتا۔ بیگم کی موت سے پہلے شاہجہاں کی ڈاڑھی میں بمشکل بیس بال سفید تھتھے، مگر بیگم کی موت کے غم میں کھوڑے ہی دنوں میں شاہجہاں کی ساری ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ (شاہجہاں نامہ)

۱۰۵۲ء میں بی بی کار و روضہ پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار کیا گیا اور بیگم نقش کو روضہ میں منتقل کیا گیا۔ جسے تاج محل کہتے ہیں۔ اس وقت شاہجہاں ممتاز سے لگاؤ کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے :

| | |
|-----------------------------|----------------------------|
| ”زہے مرقد پاک بلقیس عہد | کہ بانوئے آفاق راگشتہ مہد |
| منور مقامے چو باغ بہشت | معطر چو فردوس عنبر مرشست |
| بصنعت زحال معتبر بخور | بجاروپ مژگاں درش رفتہ حور |
| جواہر نگا است دیوار در | ہوا تازہ وتر جو آب گوہر |
| عمارت گراں مقدس جناب | ز سرچشمہ فیض آوردہ آب |
| بریں بقعہ پاک والا مقام | ترشح کناں ابر رحمت مدام |
| اگر عاصی آرد بریں روضہ رونے | کند نامہ خویش راشت و شوئے |
| ز رقت نظر رۂ ایں مزار | شود چشم خورشید و مہ اشلبار |
| نمود ایں عمارت بنار و زگار | کہ ظاہر شود قدرت کردگار |

شاہجہاں نے بی بی روضہ کے اخراجات کے لیے انیس گاؤں وقف کر دیے۔ حقیقت میں تاج محل شکستہ دیوں اور نامرادوں کو درسِ حیات دے رہا ہے۔ یہ باہمی محبت و خلوص کی یادگار ہے ممتاز محل میں جذبہ شوہر پرستی بے پناہ تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو شوقِ تعلیم نوا اور جدید تہذیب کی بدولت متاثر رہا ہے۔ ہماری

لڑکیوں کے دلوں میں بھی شوق پیدا ہو۔ اور وہ ممتاز کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ ممتاز کی آرزوؤں کا مرکز اور محبت و خلوص کا کعبہ شاہجہاں تھا وہ ہر مصیبت اور ہر حالت میں اس کے ساتھ رہی۔

مولانا سیما بکبر آبادی نے اس الہام کدہ تاج میں بیٹھ کر اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل نظم میں کیا ہے ملاحظہ ہو :

” فضا اے تاج تری دل نشین معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہدوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے
ضیا تیری ضیائے بہترین معلوم ہوتی ہے
تری محراب حوروں کی جہیں معلوم ہوتی ہے
تری بیٹا اور پھر ہے نیاز انقلاب ایسی
جہاں معلوم ہوتی کھتی وہیں معلوم ہوتی ہے
تری تابانیوں کا کیوں نہ اس کو معجزہ کیجیے
اندھیری رات بھی تو چودھویں معلوم ہوتی ہے
تری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکوں کیا کیا
تری تصویر کتنی دل نشین معلوم ہوتی ہے
تیرے نظارے سے جذبے محبت کے لرزے تے ہیں
دفاؤ حسن کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے
تری معصومیت جس کو تصور چھو نہیں سکتا
مجسم ایک خوب مرمریں معلوم ہوتی ہے
اگر ہوگی تو جنت نقل ہوگی ترے باغوں کی
بہارِ خلد تری خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے

نمایاں ہیں ہر ایک — ذرہ سے اتارِ درخشانی
یہ خاک اب تک ستاروں کی امیں معلوم ہوتی ہے
یہ وہ ماحول ہے جس کے محیطِ نور میں گھر کر
نگاہِ حسن اکثر شرم گیں معلوم ہوتی ہے
وہ عظمتِ بوخفا ہو کر گئی ہے قومِ مسلم سے
حجابِ تاج میں گوشہ نشین معلوم ہوتی ہے
وہ رفعت جس کا ماتم کر چکی ہے قسمتِ مسلم
انہیں تسکین کا ہوں میں مکین معلوم ہوتی ہے
وہ لذتِ جذب کرتا ہے جو اس منظر سے نظارہ
محبت کی نگاہِ اولیں معلوم ہوتی ہے
ملفوظِ اے سیاحِ روح عزتِ شاہی
گیاہ و سبزہ میں خلوت نشین ہوتی ہے
حقیقت کی یہ وہ منزل ہے جس کے ذرہ ذرہ میں
تجلی ایک مہمانِ حسین معلوم ہوتی ہے
نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر گام پر میرا
مرے سجدوں کے قابل یہ زمیں معلوم ہوتی ہے
یہ عالمِ محویت کا وقت سیرِ تاج ہوتا ہے
کہیں ہوتا ہوں میں دنیا کہیں معلوم ہوتی ہے
جسے سیما بارضِ تاج کہتے ہیں فرشتے بھی
وہ میرے ہی وطن کی سرزمین معلوم ہوتی ہے

ممتاز محل بہت ہی نرم اور سخی طبیعت خاتون تھی جب اس کی رحمت برستی تھی تو لوگوں کو
تختِ دار سے بھی اتار لاتی تھی۔ مغربی مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاج محل کی عمارت

کا مغرب والوں کے دماغوں کی دین ہے مگر یہ بات بالکل غلط ہے کہ تاج محل کو بنانے والا معمار نادر الزمان
حامد لاہوری تھا۔ یہ روضہ دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور آج تک اس کی خوبصورتی آنکھوں کو
چکاچوند کر دیتی ہے۔

ممتاز محل کے بطن سے چودہ بچے پیدا ہوئے۔ (شہزادہ خرم کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی
۱۱ اگست ۱۶۱۱ء کو پیدا ہوئی تھی جس کا نام پریمزبانو تھا۔ پرورش رقیہ بیگم نے کی مگر ایک سال بعد اس کا
انتقال ہو گیا)۔

- ۱۔ حور النساء بیگم ۸ صفر ۱۰۲۲ء کو آگرہ میں پیدا ہوئی۔
- ۲۔ جہاں آرا بیگم ۲۱ صفر ۱۰۲۳ء کو اجیر میں پیدا ہوئی۔
- ۳۔ داراشکوہ ۲۹ صفر ۱۰۲۴ء کو اجیر میں پیدا ہوا۔
- ۴۔ محمد شجاع ۱ جمادی الآخر ۱۰۲۵ء کو اجیر میں پیدا ہوا۔
- ۵۔ روشن آرا بیگم ۱۰۲۶ء کو برہان پور میں پیدا ہوئی۔
- ۶۔ اورنگ زیب ۱۵ رزی قعدہ ۱۰۲۷ء کو ودھات میں پیدا ہوا۔
- ۷۔ امیر امید بخش ۱۱ محرم الحرام ۱۰۲۹ء کو سرہند میں پیدا ہوا۔
- ۸۔ ثریا بانو بیگم ۲۰ رجب المرجب ۱۰۳۰ء کو پیدا ہوئی اور سات سال کی عمر میں وفات پائی۔
- ۹۔ ایک اور بیٹا پیدا ہوا جو ۱۰۳۱ء کو وفات پا گیا۔
- ۱۰۔ مراد بخش ۲۵ رزی الحجہ ۱۰۳۳ء کو ایٹم میں پیدا ہوا۔
- ۱۱۔ لطف اللہ ۱۰۳۶ء میں راہگزر عالم علوی ہوا۔
- ۱۲۔ دولت افزا ۱۰۳۷ء میں پیدا ہوئے اور دوسرے سال وفات پائی۔
- ۱۳۔ ۱۰۳۹ء ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اسی سال وفات پائی۔
- ۱۴۔ گوہر آرا بیگم ۱۷ رزی قعدہ ۱۰۴۰ء کو پیدا ہوئی (برہانپور)

ارجمند بانو کی نسبت خرم سے ہو تو گئی مگر اس شادی سے پہلے جہانگیر نے خرم کی نسبت مرزا مظفر حسین صفوی خانوادہ اسماعیل شاہ ایران کی بیٹی سے کر کے ۲۹ اکتوبر ۱۶۱۱ء کو شادی کر دی یہاں یہ بات قابل غور ہے شہزادہ خرم کی شادی اپنی پہلی منگیتر (ارجمند بانو) سے نہ ہوئی تو دوسری کی کیا ضرورت تھی اس وقت شہزادہ عمر بھی شادی کے قابل نہیں تھی نہ شادی ہی فوراً کر دی گئی۔ صفوی شہزادی سے شادی ایک سال بعد ہوئی اس زمانہ کی تحریروں سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ صفوی شہزادی سے خرم کی کوئی محبت تھی، سیاسی وجہ بھی پس پشت نظر نہیں آتی۔

۳۰ مارچ ۱۶۰۶ء کو شیر افکن کے قتل کے بعد مہر النساء قصر شاہی میں سلیمہ بیگم کے ساتھ رہنے لگی۔ تھی، گمان غالب ہے کہ جہانگیر — نور جہاں کو دیکھنے کے بعد اپنی تمنا کی درخواست پیش کرنے لگا مگر جہانگیر کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ نور جہاں نے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ جہانگیر اب اس کی بھتیجی (ارجمند بانو) سے نسبت ہونے کے بعد خرم کی شادی میں دلچسپی چھوڑ دیتا ہے اور نور جہاں کو ایک طرح کی دھمکی دے کر اپنے اثر میں کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ نور جہاں کو بھتیجی کی خرم سے شادی نہ ہونے کا صدمہ پہنچے۔ آخر یہ چال چل کر جہانگیر کامیاب ہوا اور ۲۵ مئی ۱۶۱۱ء کو خرم اور ارجمند بانو کی شادی ہو گئی۔ مگر اس بات کا بھی کوئی مستند ثبوت نہیں کہ جہانگیر نے نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے یہ چال پھیلایا ہو یہ تو صرف ڈاکٹر بنارسی پر شاد کا خیال ہے۔ جو قابل یقین نہیں۔ ہاں خرم کی تیسری شادی شاہنواز خاں ابن عبدالرحیم خان خاناں کی لڑکی سے سیاسی وجہ سے ۲۳ اگست ۱۶۱۶ء میں ہوئی۔

ماہم بیگم

نصیر الدین محمد ہمایوں مرزا کی ولادت کابل کے قلعہ میں بروز منگل ۶ مارچ ۱۵۵۸ء کو رات کے وقت ہوئی۔ اس وقت بابر کابل کا حکمران تھا۔ ہمایوں کے جسم میں بابر کی طرح ایشیا کے دو مشہور فاتح چنگیز اور تیمور کا خون شامل تھا۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا تیمور کی چوٹھی پڑھی اور اس کی والدہ خبر ونگا خانم چنگیز کی تیرہویں پڑھی میں تھی، اس طرح ہمایوں والدہ کی طرف سے تیمور کی چھٹی پڑھی اور اپنی دادی محترمہ کی جانب سے چنگیز کی پندرہویں پڑھی سے تھائی یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بابر نے ہمایوں کی پیدائش پر ہی مرزا کی جگہ بادشاہ کا لقب اختیار کیا اسی تاریخ سے مغل شہزادے حکمران بن جانے کے بعد اپنے نام سے مرزا لفظ کو ہٹا کر بادشاہ لکھنے لگے۔

ماہم بیگم نصیر الدین محمد بابر بادشاہ کی چھٹی بیوی اور نصیر الدین محمد ہمایوں کی والدہ تھی۔

ماہم بیگم کی ابتدائی زندگی اور اس کے خاندان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہو سکی۔ اس زمانے کے سب سے مورخ ماہم بیگم کے بارے میں خاموش ہیں۔ معاصر مورخین نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ سلطان حسین مرزا اور خراسان کے مشہور درویش شیخ ابوالنصر احمد جہاں کے خاندان سے تھی۔ ابوالنصر احمد جہاں زندہ پیل ایران کے ایک معروف صوفی تھے ان کا جنم ۱۰۴۹ء مطابق ۱۶۴۱ء میں ہوا تھا ۲۲ سال کی عمر میں انھوں نے مذہبی زندگی اختیار کی اور پہاڑوں اور صحراؤں میں زندگی بسر کرنے لگے اس کے بعد انھوں نے شادی کی اور ۳۹ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں جو آخر میں ۱۴ لڑکے اور تین بیٹیاں ہی زندہ رہیں ان کی تصانیف میں رسالہ سمرقندی اور کراہ حقیقت وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ایران اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں ان کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے تیمور اور ہمایوں نے زندہ پیل کی درگاہ کے لیے سفر کیا۔

۱۔ بابر نامہ ص ۴۴۳
۲۔ ہمایوں نامہ گلابیوں بیگم ص ۹۰

اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم (مریم مکانی) بھی اسی خاندان سے تھیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہم بیگم ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ خاندان تعلیم یافتہ تھا بابر نے ماہم بیگم سے ہرات میں ۱۵۰۶ء میں شادی کی۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بابر کی نو بیویوں کا ذکر کیا ہے۔

ماہم بیگم کے لیے آ کا لفظ کا استعمال ہوا ہے اسی لیے آ کا بیگم بھی کہتے تھے آ کا لفظ کے معنی ملکہ کے ہیں اور یہ لفظ سردار یا صدر کے لیے استعمال ہوتا تھا ہے۔ بیورج نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ماہم بیگم کے خاندان کا سرائے لگانا مشکل کام ہے۔ بقول ڈاکٹر اشوری پرشاد کہ ماہم بیگم منل نہیں تھی۔ ماہم بیگم ٹرانس آکسیانہ اور حصار کے معرکوں میں بابر کے ساتھ رہی۔

بابر کی بیگمات کے نام اس طرح ہمایوں نامہ میں تحریر ہے :

- ۱۔ آئشہ سلطان بیگم :- یہ بابر کے چچا سلطان احمد کی دختر تھی اور ۱۵۰۶ء میں شادی ہوئی ایک سال بعد اس کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جو ایک مہینے بعد مر گئی۔ (ہمایوں نامہ)
- ۲۔ زینب سلطان بیگم :- سلطان احمد مرزا (بابر کے چچا) کی بیٹی اور آئشہ سلطان بیگم کی ہمیشہ تھی ۱۵۰۶ء میں شادی ہوئی مگر بد قسمتی سے دو سال بعد انتقال ہو گیا۔ (بابر نامہ)
- ۳۔ معصومہ سلطان بیگم :- یہ سلطان احمد مرزا بابر کے چچا تھا۔ پانچویں دختر تھی ۱۵۰۶ء میں شادی ہوئی اور دو سال بعد بیٹے کی پیدائش میں وفات پائی اس کی ایک بیٹی کا نام بھی معصومہ سلطان رکھ دیا۔ (گلبدن ہمایوں نامہ، ص ۲۶۳-۵۵)
- ۴۔ ماہم بیگم :- بیگم کے یہاں پانچ اولادیں ہوئیں :- (۱) بار بول مرزا، ۲۔ مہربان

۱۔ اینسائیکلو میڈیا آف اسلام ج اول ص ۱۹

۲۔ گلبدن بیگم ہمایوں نامہ بیورج ص ۲۵۶

۳۔ بابر نامہ بیورج ص ۳۴۲۔

۴۔ ہمایوں نامہ ص ۹۱ بابر نامہ ص ۳۵۸

(۳) احسانی دولت بیگم (۴) فاروق مرزا (۵) ہمایوں مرزا، فاروق — کی موت کے بعد بیگم پر بادل ٹوٹ پڑے ماہم بیگم نے گلبدن کو اپنی بیٹی بنالیا۔

۵۔ گل رخ بیگم :- اس کے خاندان کے بارے میں مورخین خاموش ہیں اتنا ضرور کہا جاتا ہے کہ گل رخ کی شادی ۱۵۱۹ء میں ہوئی۔ اس کے پانچ بیٹے پیدا ہوئے اور کامران اور عسکری ہمایوں کے لیے سرور دینے :

۶۔ دلدار آغاچہ :- یہ زینب بیگم کی بہن تھی زینب بیگم جو بابر کی بیوی جس کا انتقال

ہو گیا تھا ۱۵۰۹ء میں شادی ہوئی۔ اس کی یہاں پانچ اولادیں پیدا ہوئیں (۱) گل بدن بیگم (۲) گل چہرہ بیگم (۳) مرزا ہندال (۴) گلبدن (۵) الور۔ (ہمایوں نامہ ص ۲۲۶-۲۲۵)

۷۔ مبارکہ بی بی :- یہ شاہ یوسف زئی کی بیٹی تھی۔ ۳ جنوری ۱۵۱۹ء میں شادی ہوئی اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ (بحوالہ ہمایوں نامہ اور اکبر نامہ)

۸۔ گلنار آغاچہ : فارگل آغاچہ :- یہ دونوں گلبدن بیگم کے ساتھ خانہ کعبہ بھی گیش اور زندگی کے آخری ایام میں بامو کو ان دونوں سے زیادہ محبت ہو گئی۔ گلنار بیگم ہندال کی شادی میں شریک تھیں۔

تاریخ شاہ رخ کے مصنف نیاز محمد کلنڈی نے بابر کی دسویں بیوی کا نام سیدہ آفاق تحریر کیا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ماہم بیگم تیموری خاندان کی چشم چراغ تو نہ تھی مگر یہ ضرور ہے کہ بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور تیموری خاندان سے رشتہ داری کا بھی تعلق تھا اسی لیے مغل شہزادیوں کے ساتھ ماہم بیگم کا ذکر نہ پایا نہ ہوگا۔ ماہم بیگم علم و ادب سے بے حد ذوق رکھتی تھیں اسی لیے انھوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے دہلی میں خیر المنازل کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اس مدرسہ کی عمارت اب منہدم ہو گئی ہے۔ یہ مدرسہ پرانے قلعہ کے پاس واقع ہے اس مدرسہ کا ذکر سر سید احمد نے بھی آثار الصنادید میں کیا ہے۔ آثار الصنادید میں مسجد کے کتبہ کی عبارت اس طرح نقل کی ہے۔

۱۔ آثار الصنادید باب اول ص ۲۷

ید و رانی جلال الدین محمد اکبر کہ باشد اکبر شاہانِ عادل
 چو ماہم بیگم عصمت پناہی بنا کرد این بنا مہر افانسل
 ولے شد ساعی این بقعہ خیزد شہاب الدین احمد خاں کاڈل
 رہے خیریت اس بقعہ خیر کہ شد تارنج او خیر المنازل
 بیگم نے اس مدرسے کے ساتھ طلباء کے لیے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی اس مسجد کی خوبصورتی
 کے بارے میں ایک انگریز ماہر آثارِ قدیمہ تحریر کرتا ہے :

”مسجد پانی سے گھسے ہوئے نوکدار پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ جہاں نقش و نگار کش
 وہیں سُرُخ پتھر اور گرانیت لگائے گئے ہیں۔ پھاٹک گواب مسمار ہو چکا ہے بہت ہی خوبصورت
 ہے مسجد کا اندرونی حصہ رنگین ہے پلاسٹر اور چمکدار اینٹوں سے مزین ہے عمارت کا رُخ اور
 پھاٹک رنگین سفید اور تراشے ہوئے پتھروں کے پھولوں سے منقش ہیں ان میں رنگ نیلے زر
 سُرُخ ارغوانی سفید اور سیاہ استعمال کیے گئے ہیں اس مسجد میں صرف ایک گنبد ہے جس کی
 گردن نیچی ہے اس کا کنگرہ بہت ہی عجیب و غریب ہے جو ”مسیٰ قلد کو نہ“ کے کنگرے
 سے مشابہ ہے۔ مسجد کی دیواریں عمودی ہیں لیکن منارے ڈھلوان ہیں موقی مسجد کی خارج چھتے سانے
 نکلے ہوئے ہیں اس میں حجرے ہیں جو اور مسجدوں میں کچھ گئے ہیں۔“

یہ مسجد ماہم بیگم کی دینی تعلیم کی دلچسپی کی آئینہ دار ہے۔ ماہم بیگم نے یہ مسجد طلباء کے لیے جُڑن
 فیاض دلی سے بنوائی جو طلباء کے حصولِ تعلیم کی مرکز بنی یہ مسجد اس بات کی بھی مثال ہے کہ مغل خواتین
 اس دور میں علم کے فروغ کے لیے ایک خاص جذبہ رکھتی تھیں اور بذاتِ خود بھی تعلیم و تربیت سے
 آراستہ تھیں۔

ماہم بیگم کے لہن سے مرزا فاروق تھا اس کی موت کے غم کو بھلا نے کے لیے گلبدن بیگم
 کو بیٹی بنالیا اور اسے اپنے محل میں لے گئیں گلبدن نے بیگم کے پاس ہی پڑوس پائی۔ ماہم بیگم کی

۱۔ بہا لوجی آف دہلی مولفہ می اسٹیٹن بحوالہ پرموشن آف محمد ن رنگ مرتبہ ن لاہور ۱۳۳۱

کی موت کے بعد گلبدن بیگم اور ہمایوں دونوں کو بیگم کی یاد تڑپاتی رہی اس کی وفات کے واقعہ کو گلبدن بیگم یوں بیان کرتی ہیں :

”ماہ شوال کے آغاز میں میری والدہ کے پیٹ میں کچھ تکلیف پیدا ہوئی ۱۳ ماہ مذکور ۹۴۲ھ اس دنیا سے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں اور اس کے فرزند و بلند حضرت ہمایوں کا داغ یتیمی تازہ ہو گیا۔ میرا حال نہایت پریشان تھا۔ مرحوم نے مجھے پالا تھا، میرے دل میں ہو کیس اُکھٹی تھیں۔ اس سخت صدمے کی وجہ سے میرے حواس بجا نہ رہے میں دن رات روتی تھی بادشاہ سلامت کی مرتبہ میرے پاس آتے، مجھے ہر دم دلاسا دلاتے میری عمر دو سال تھی اور میری پرورش کی میں دس سال کی ہوئی تو وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں میں ایک برس تک اپنی والدہ مرحومہ کے محل میں مقیم رہی اور جس وقت ہمایوں بادشاہ دھولپور کو گئے میں گیا رہیں سال کے آغاز میں اپنی حقیقی والدہ کے پاس چلی گئی۔ (ہمایوں نامہ ص ۳)

حمیدہ بانو بیگم مریم مگانی

جام کا علاقہ جو ایران کی سرزمین پر واقع ہے علم و ادب کا گہوارہ۔ مانا جاتا ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کی سرزمین رہی ہے مولانا جاتی اور ہاتھی جیسے عظیم شاعروں کا بھی اسی سرزمین سے رشتہ تھا۔ حضرت احمد جام زندہ پیل بیسا سو فی سترست اور زبردست شاعر بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتا تھا۔

حمیدہ بانو بیگم کا مغل شہزادیوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کیوں کہ حمیدہ بانو بیگم شیخ علی اکبر کی دختر بلند اختر تھی۔ شیخ علی اکبر کے والد کا نام شیخ احمد جام تھا۔ شیخ علی اکبر کو باہر کے دربار سے میر باہار دست کا لقب مل چکا تھا اور باہر نے حمیدہ بانو سے بہت

رشتہ دار ہونے کا اقرار لیا ہے جس کا اختاف گلبدن بیگم نے ہمایوں نامے میں ہی لیا ہے۔

حمیدہ بانو بیگم کی زندگی کے ابتدائی حالات اور اس کی ولادت کے بارے میں مورخین خاموش ہیں۔ اتنا کہا جاتا ہے کہ شادی کے وقت حمیدہ بانو بیگم کی عمر ۱۳ سال تھی اور سن ۹۴۰ھ میں ہوئی تو اس حساب کے مطابق بیگم کی پیدائش ۹۳۴ھ قرار دیا گیا ہے۔ حمیدہ بانو بیگم کی شادی کے بارے میں گلبدن بیگم نے ایک نہایت پر لطف واقعہ بیان کیا ہے۔

شیر شاہ ۹۴۰ھ میں جب ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان پر قابض ہوئے۔ جانیوں کی بے وفائی غیروں کی غدارمی قسمت کی بد نصیبی ہمایوں کی سب امیدیں خاک میں مل گئیں تو اسے اپنی لغزشوں کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اسے اپنی غفلت شعاریوں و سہل انکاریوں کا احساس ہو رہا تھا۔ چاروں طرف یاس کے بادلوں میں گھرا ہوا عالم خواب میں اسے ایک عجیب و غریب منظرہ آیا۔ جس کا تذکرہ گلبدن بیگم ہی کے الفاظ میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے :

”آپ نہایت رنجیدہ و غمگین تھے بستر پر تشریف لے گئے آنکھ لگ گئی خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ تشریف لائے سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہاتھ

سے کہا کہ آخر کس کے پتے تو بندھے گی تو کہتی ہے کہ ہاں اس سے بندھوں گی جس کے گریبان تک میرے ہاتھ پہنچیں نہ اس سے کہ مرا ہاتھ اس کے دامن تک بھی نہ پہنچے۔“

بزرگ کی پیش گوئی کے مطابق ہمایوں کے یہاں فرزند کی ولادت ۴ رجب ۹۴۹ء امرکوٹ میں حمیدہ بانو بیگم کے لطن سے ہوئی اور نام جلال الدین محمد اکبر ہی رکھا۔ ہمایوں کی ہمیشہ شہزادی سلطانہ حمیدہ بانو بیگم کے اخلاق سے بے حد متاثر تھی اکبر کی پیدائش کے بعد ہمایوں کو کامیابی ملتی دکھائی دینے لگی اور آخر ہندوستان پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۴۲ء میں حمیدہ بانو بیگم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کے بعد ہمایوں نے ماہ کوچک سے شادی کی مگر حرم کے سارے انتظامات حمیدہ بیگم کے ہاتھ میں رہے۔ ۱۵۴۱ء میں حمیدہ بانو نے اکبر کے ساتھ گل بہار کی سیر کی اور ۱۵۵۱ء کو بیگم کابل سے ہندوستان آگئیں۔

حمیدہ بانو بیگم میں سیاسی شعور بھی تھا۔ اپنی صلاحیت اور تجربہ کی بنا پر بیگم نے بیرم خاں کے بڑھتے ہوئے اثر کو بھی روک دیا اور اکبر اور شہزادہ سلیم کے درمیان اختلاف کو بھی سلیم سلطان اور حمیدہ بانو بیگم نے ہی ختم کرایا۔ ۱۵۴۲ء میں حمیدہ بانو اس دنیا سے فانی سے رخصت ہو گئیں اکبر نے والدہ کی موت کے سوگ میں ماتمی لباس پہنا اور اکبر کی تقلید اس کے امرائے بھی کی اکبر اور دیگر امراء نے حمیدہ بانو بیگم کی میت کو کاندھا دیا اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا۔ جہاں ۵۷۱ شاہی قبریں ہیں جن میں فرخ سیر، داراشکوہ، اعظم شاہ، جہاندار شاہ اور عالمگیر ثانی کی قبریں شامل ہیں۔

ہمایوں کا مقبرہ دہلی میں واقع ہے جو عرب سرانے سے ملحق ہے یہ بہت ہی کشادہ بنائی گئی ہے۔ بیگم کے ساتھ چند عرب حجاز مقدس سے ہندوستان آئے اور انھیں کے اعزاز میں یہ سرانے بنوائی گئی تھی۔

حمیدہ بانو بیگم غریب پرور اور مسکین نواز خاتون تھی وہ بے کس ولاچار انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جانوروں اور حیوانوں پر بھی رحم کرتی تھی۔ وہ فرما بردار بیوی اور مہربان ماں تھی وہ بہت ہی دین دار پرہیزگار سخی دل، غیور طبیعت، لحاظ دار مزاج کی خاتون تھی۔ تعلیم و تربیت، قابلیت اور

صلاحیت کی حمید بانو بیگم بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اکبر کی پہلے دور کی زندگی میں جو مذہبی جوش و خروش اور سرگرمی نظر آتی ہے وہ اس کی والدہ حمیدہ بانو بیگم کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر تھا کہ اکبر شیخ عبدالسلام اور شیخ عبدالغنی کے گھر پر خود پہنچ کر درس حدیث میں شامل ہوتا ہے اور مسجد میں اکبر خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیا کرتا تھا، پنڈتوں سے بحث و مباحثہ کرنا اور بدعتیوں کو عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔

ایک بار سالگرہ کے موقع پر اکبر نے اپنے کپڑوں میں زعفرانی رنگ چھڑکا اور اسی حالت میں دربار میں چلا آیا شیخ عبدالغنی نے جب یہ نقشہ دیکھا تو وہ مارے غصہ کے آپسے سے باہر ہو گئے وہ لکڑی لے کر اکبر پر چھیڑے اور بھرے دربار میں اسے لکڑی سے پیٹا، اکبر اس وقت تو شیخ کے تقدس اور مذہبی احترام کی بنا پر خاموش رہا مگر — دربار کے بعد — والدہ مریم مکانی نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بیٹا نجاتِ اخروی اسی میں ہے کیا یہ تمہارے لیے باعثِ فخر و مبارک بات نہیں کہ قیامت تک تمام دنیا میں یہ چرچہ رہے گا کہ ایک مفلوک الحال درویش نے بھرے دربار میں شہنشاہ عالی وقار کے ساتھ ناقابلِ برداشت سلوک روا رکھا مگر اس نے نہایت صبر و ضبط سے کام لیا۔ یہ تھی مریم مکانی، شہنشاہِ وقت کی بیگم کی تعلیم و تربیت جو سب کچھ ہوتے ہوئے بیٹے کو نصیحت کرتی ہیں اور ایک بزرگ کی ہدایت کا احترام اس انداز سے کیا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں مل سکتی، آج ہماری بیٹیاں اور بیٹے اور اعلیٰ مراتب رکھنے والے مریم مکانی کی تعلیم اور نصیحت سے فیض اٹھا سکتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی ہدایت پر چل کر مقصدِ حیات پاسکتے ہیں۔

مریم الزماني

اکبر اعظم کی مریم الزماني سے شادی قرون وسطیٰ میں بہت مفید ثابت ہوئی۔
 مولانا محمد علم الدین اپنی معروف تصنیف میں یوں تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”اکبر اعظم کی مریم الزماني سے شادی نے ایک طرف تو سلطنتِ تیموریہ
 کی پاسبانی کے لیے راجپوتوں کی ایک جماعتِ عظیم پیدا کر دی اور
 دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کی رو کو یک قلم بدل کر اصلی
 ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھ دی اور ایسی بنیاد جس پر ہندو مسلم
 اتحاد کی مستحکم عمارت تعمیر ہوئی یہ اسی عمارت کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلم
 ہندوستان کی دو آنکھیں بن گئے۔ اور سگے بھائیوں کی طرح رہنے
 سہنے لگے۔ مذہبی تنازعات اور معاشرتی فسادات مٹ گئے کوہِ
 ہمالیہ سے لے کر راسِ کماری تک اور دریائے سندھ سے لے کر
 بنگال کے پرے سرسائیک ایک تمدن اور ایک معاشرت کا
 جلوہ نظر آنے لگا۔“

تمام مورخین اس بات کو مانتے ہیں کہ مریم الزماني اکبر کی حرمِ محترم تھی۔ مگر طبقاتِ
 اکبری، اکبرنامہ، تاریخ الفی اور منتخب اللباب کے مصنفین اس کے نام کے لیے خاموش ہیں
 صرف جہانگیر لکھتا ہے کہ ”مریم الزماني اس کی والدہ مکر می تھی“ میسٹر بیورج نے اپنے ایک
 مضمون میں لکھا ہے کہ مریم الزماني سلیم سلطان کا ہی خطاب تھا۔ مگر بیورج کا یہ دعویٰ
 بالکل غلط ہے۔

۱۔ دخترانِ ہند ص ۵۵

۲۔ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۹۰۶

تاریخ آگرہ کے فاضل مصنف خان بہادر سید عبداللطیف نے تین مختلف مقام پر تین خواتین کو مریم الزمانی کے لقب سے خطاب کیا ہے ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”جودھا بانی یا شہزادی جودھ پورا کبر کی ملکہ اور جہانگیر کی والدہ تھی۔
 وہ راجہ مال دیو رائے جودھ پور کی دختر بلند اختر تھی جس طرح اکبر کی والدہ مکرملہ کا خطاب مریم مکانی تھا اس طرح جہانگیر کی والدہ کا خطاب مریم الزمانی تھا۔“

دوسرے مقام پر یوں تحریر کرتے ہیں کہ :
 ”مریم الزمانی ایک پرتگالی خاتون تھی جو اکبر کی ایک بیوی تھی۔“
 تیسرے مقام پر بیان کرتے ہیں کہ :

”عمارت کے ہندو وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکبر کی ہندو ملکہ یعنی دختر راجہ بہا ری مل المقلب بہ مریم الزمانی کا محل ہے۔“

مگر مختلف تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ مریم الزمانی نہ تو جودھا بانی تھی نہ راجہ مال دیو کی دختر نہ پرتگالی خاتون نہ سلیم سلطان لقب تھا۔ بلکہ حقیقت میں وہ راجہ بہار مل دالی (جے پور) کی لڑکی تھی اور یہی ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کی شادی کے بعد مریم الزمانی کے نام سے مشہور ہوئی اور اکبر نے خوش ہو کر اسے شاہ بیگم کا خطاب عطا کیا۔

۱۹۶۹ء میں یہ شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے بعد مریم الزمانی نے اپنے آپ کو تیموری تہذیب و تمدن میں ڈھال لیا اور مسلم اصولوں کے پابند ہو گئی۔ زندگی کے آخری ایام میں تو وہ سچی پکی مسلمان ہو گئی تھی۔

۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ بروز چہار شنبہ بادشاہ بیگم کے بطن سے فرزند پیدا

ہوا، جس کا نام شیخ سلیم چشتی کے نام پر سلیم رکھا اکبر اسے شیخو کے نام سے پکارتا تھا
 شہزادہ کی پیدائش کے بارے میں بھی مؤرخین کی الگ الگ رائے ہیں۔ تزک جہانگیر کے
 صفحہ نمبر ۲۰۲ پر طبقات اکبری کے صفحہ نمبر ۲۸۷ پر خفی خاں کی تصنیف صفحہ نمبر ۷۴ پر
 خلاصۃ التواریخ کے ورق نمبر ۳۴ پر اور تاریخ فرشتہ میں شہزادہ کی تاریخ ولادت
 ۹۷۸ھ میں تحریر ہے۔ یہ تاریخیں بالکل غلط ہیں شہزادہ کی تاریخ پیدائش ۱۷ رجب الاول
 ۹۷۸ھ بروز چہار شنبہ صحیح ہے۔

مریم الزمانی ۹۸۶ھ میں آگرہ سے دہلی آئیں ۹۹۲ھ میں اس نے شہزادہ سلیم
 کی شادی بھگوان داس کی دختر سے کرائی ۱۰۱۴ھ میں اکبر کے انتقال کے بعد مریم الزمانی
 کی زندگی کا چین و آرام ختم ہو گیا۔ بیگم کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اکبر کے ساتھ شکار کو جایا
 کرتی تھی بیگم نے اپنے ہی خرچے سے 'برہ' مقام پر ایک باغ اعلیٰ سرے اور نفیس باولی
 تعمیر کرائی۔

بیگم صاحبہ نے ۱۰۳۲ھ کو اس داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ خبر جہانگیر
 کو اجیر میں ملی۔ بیگم کا مقبرہ سکندرہ میں سلطان سکندر لودی کی بارہ دری میں واقع ہے۔
 بیگم بہت ہی پاکیزہ خصلت، انصاف پسند، مخلص طبیعت، خلیق، بامروت
 سلیقہ شعار اور حسن ظاہری سے آراستہ تھی وہ نظام سلطنت اور سیاسی بصیرت کا شعور
 رکھتی تھی، وہ نہایت مخیر معنی تھی۔ بیگم نے لاہور میں بھی ایک مسجد تعمیر کرائی جو بیگم مسجد کے
 نام سے مشہور ہے۔

جودہ بانی

جودہ بانی کے لفظی معنی جودھ یعنی جودہ پورا اور بانی معنی لڑکی یعنی جودہ پور کی لڑکی یہ نقطہ ہر جودہ پور کی لڑکی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے لکھنوی، دہلوی وغیرہ۔

تمام مورخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جودہ بانی جہانگیر کی رانی تھی اور خرم اسی کے بطن سے پیدا تھا۔ جودہ بانی تاریخ جگت گوسا میں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ خرم کی والدہ جگت گوسا میں کی تصدیق تزک جہانگیری سے ہوتی ہے۔ مگر جہانگیر نے خرم کی پیدائش کی جو تاریخ ۹۹۹ھ میں تحریر کی ہے اس سے عمل صراح، خفی خاں اور ہسٹری آف لاہور کے مؤلف خان بہادر سید محمد لطیف اتفاق نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ خرم ۱۰۰۰ھ ربیع الاول ۱۰۰۰ھ کو جگت گوسا میں کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور خرم کی پرورش زفیہ بیگم جو اولاد کی دولت سے محروم تھی اس کے سپرد کی گئی۔ (بجوالہ دختران ہند، از مولانا محمد علیم الدین صفحہ ۹۶)

شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد خرم کی والدہ عظمت کے وقار میں بھی اضافہ ہوا، اور شہزادہ خرم کی ترقی بھی والدہ کے ہی دم سے وابستہ تھی۔ جگت گوسا میں نے ہی خرم کی شادی مظفر حسین خاں کی دختر بیگم صاحبہ ۱۰۱۵ھ میں کراچی گوسا میں جہانگیر کے ساتھ نور جہاں کی طرح جایا کرتی تھی۔

”شکار کے ایک واقعہ کو خفی خاں یوں تحریر کرتے ہیں کہ ”ایک دفعہ شیر کے شکار کے دوران جب شیر غراتا ہوا جہانگیر کی طرف بڑھا تو شیر کو غصہ میں دیکھ کر نور جہاں سہم گئی مگر رانی کو گوسا میں نے ہندو ق اٹھائی اور نشانہ باندھ کر گولی چلا دی، گولی شیر کے سینے میں انزل گئی۔۔۔۔۔ شیر کو مردہ اور رانی کو تھنک بردوش دیکھ کر جہانگیر بہت خوش ہوا۔“ یہ بیان بھی سنا گیا ہے کہ گولی نور جہاں نے چلائی تھی۔

جودہ بانی راہ اودے سنگھ سین والے جودہ پور کی دختر تھی وہ نازک اندام پری مثال

حُسنِ مجسمہ تھی وہ شجاع و بہادر بھی تھی۔ فنونِ جنگ میں ماہر تھی وہ سخی طبیعت اور سلیقہ شعار خاتون تھی لطیفہ گوئی میں خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ ایک بار جہانگیر سے نور جہاں نے کہا کہ حضورِ منہ سے بوائی ہے بادشاہ نے مہارانی کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کیا یہ سچ ہے اس پر مہارانی نے فوراً جواب دیا جس عورت نے صرف ایک ہی مرد کا منہ سونگھا ہو وہ خوشبو اور بدبو میں کیا تمیز کر سکتی ہے۔ نور جہاں یہ جواب سن کر اپنا سامنہ لے کر رہ گئی مہارانی کے جواب سے خوش ہو کر جہانگیر نے گلے سے موتیوں کا بار اتار کر مہارانی کو بخش دیا۔

اس سلسلہ میں مخدّراتِ تیموریہ کا مندرجہ ذیل لطیفہ بھی بہت دلچسپ ہے :

”ایک دن نور جہاں کو شرارت سوچھی اور اس نے جودہ بانی کو نیچا دکھانے کی غرض سے بادشاہ سے کہا کہ جودہ بانی رسوئی خوب پکاتی ہے بادشاہ نے فوراً ارشاد کیا کہ جودہ بانی آج تم اپنے طریقہ سے رسوئی کا انتظام کرو اور اپنے ہی ہاتھ سے پکاؤ تو ہم کھائیں جودہ بانی نے عرض کیا کہ بہت اچھا یہ کہہ کر رسوئی تیار کی گئی لیکن کھانے سے بیشتر نمک مرچ کا ذائقہ چکھ لیا نور جہاں جو اس موقع کی منتظر تھی بے ساختہ بول اٹھی کہ بادشاہ سلامت مہارانی نے تو رسوئی جھوٹی کر دی، جودہ بانی نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ جب شوہر کو جھوٹی ٹہنی چیز پسند ہے تو میں کیا کروں جہانگیر اس لطیفہ سے بہت خوش ہوا اور نور جہاں عرقِ حیات میں غرق ہو گئی یہ

جودہ بانی میں خصائلِ حمیدہ کی کوئی کمی نہ تھی وہ غریب پرور، لاچار و مجبوروں کی ہمدرد تھی اس کا خوانِ کرم ہندو اور مسلم دونوں کے لیے کشادہ تھا۔ مہارانی نے ۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی اور نور منزل کے قریب باغِ دہرہ میں دفن کیا گیا۔ منے کے بعد بیگم کو بلقیس کا لقب دیا گیا۔ ملا محمد صالح کا بیان ہے :

”نیموریوں میں یہ دستور تھا کہ حرم سرا کی بیگمات کو خاص خاص خطابات عطا کیے جاتے تھے تاکہ ان کا اصلی نام زبان پر خاص و عام نہ ہو سکے اسی لیے اکبر کی والدہ کو مریم مکانی جہانگیر کی والدہ کو مریم زمانی اور شاہجہاں کی والدہ کو بلقیس مکانی کہا جاتا تھا“ (عمل صالح ضرا و خزان ہند ص ۱۱۱)

بیگم صاحبہ کا مقبرہ مالپور اور فتح پور سیکری کے پاس خواجہ سرا کے گاؤں کے درمیان بہت ہی پختہ بنایا گیا۔ اسی کے پاس چاند ماری کا میدان ہے۔ آگرہ کے قلعہ میں بیگم کا محل جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے یہ محل بیگم کی اصلی یادگار ہے۔

ملکہ زینت محل

نواب زینت محل تو احمد قلی خاں کی چہیتی بیٹی اور بہادر شاہ ظفر کی ملکہ خاص تھی۔ نواب احمد قلی خاں شاہ درانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ملکہ زینت محل نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سے بادشاہ پر ایسا اثر کیا کہ ملکہ کا سلطنت کے تمام کاموں پر اثر ہو گیا بادشاہ نے حکم جاری کیا جس دستاویز پر نواب زینت محل کی مہر نہ ہوگی وہ غیر معتبر سمجھا جائے گا۔ دہلی میں لال کنویں کے پاس اس کا مکان تھا۔ انگریزوں نے وہ مکان نواب پٹیل کو دیدیا۔ ملکہ زینت محل نے آخری وقت بادشاہ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جلا وطنی کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہا۔



رہنیت محل
بشکریہ ڈاکٹر عتیق انور صدیقی (انچارج آل فلعه مہمہ ریم دہلی)

سلیم سلطان بیگم

یہ حسینہ ورجہ شہنشاہ بابر کی بیٹی گل رخ بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس کے والد کا نام مرزا نور الدین محمد تھا۔ اس طرح بیگم ہمایوں کی بھانجی اور بابر کی نواسی تھی۔ سلیم سلطان بیگم کو حسن کی دیوی اور نور کی پتی کہتے تھے اس کی پہلی شادی بیر خاں کے بیٹے سے ہوئی اور شوہر کی وفات کے بعد بیگم کی شادی اکبر سے ہوئی۔ سلیم بہت ہی بہادر سخی دل اور عقلمند تعلیم یافتہ خاتون تھی۔

تنزک جہانگیری کی بنا پر مولانا محمد حسین آزاد دربار اکبری کے صفحہ ۳۶ پر تحریر کرتے ہیں کہ سلیم سلطان کی شادی صرف پانچ سال کی عمر میں ہوئی۔ مگر حیرت ہوتی ہے جبکہ تیموریہ خاندان کی شہزادیوں کی شادیاں ۱۸، ۲۰ اور ۲۲ سال کی عمر میں ہوتی تھیں۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیری پر ہندو رانیوں کا اثر تھا۔ کیونکہ ہندو بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھتے اور ہندو تمدن کے خلاف مانتے ہیں۔ شادی کے وقت جب بیرم خاں پورے عالم شباب پر تھا تو غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ صرف پانچ سال کی بچی سے شادی کس طرح کرتا ہے تو واقعات کا منہ چڑھانا ہے۔

۹۶۷ء میں جب سلیم سلطان اپنے شوہر کے ساتھ حج کو جا رہی تھی تو راستہ میں بیرم خاں کو ایک افغان نے قتل کر دیا ایک طرف شوہر کے غم میں اشکبار دوسری طرف اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس کے بعد سلیم سلطان کی شادی اکبر سے ہوئی اور ۹۸۳ء میں گلبدن بیگم کے ساتھ حج کو گئیں اور ۳۴ برس میں چار بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئی۔

سلیم سلطان کو سیاست میں ملکہ حاصل تھا اکبر اکثر سیاسی اور ملکی نظام میں بیگم سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ سلیم سلطان کی زندگی کے آخری ایام بڑے سکون سے گزرے۔

”سلیم سلطان بیگم کی وفات ۱۰۲۱ھ کو ۷۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ بیگم نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی باغ منڈا میں تیار کرایا تھا۔ چنانچہ اعتماد الدولہ نے نہایت تزک و احتشام سے بیگم کو اسی مقبرہ میں دفن کرایا۔“ (تزک جہانگیری ص ۱۱۳)

سلیم سلطان بیگم حقیقت میں نیک طبیعت خوش مزاج شیریں کلام شیریں بیاں زبان حاضر جواب بذلہ سنج باسلیقہ اور صاحب تدبیر خاتون تھی بیگم کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ وہ حسین سیرت کے ساتھ ساتھ حسین صورت سے بھی مالا مال تھی۔ مختلف علوم و فنون کے علاوہ شاعری میں بھی درک رکھتی تھی۔“

(حفی خاں منتخب الباب ص ۱۷۳)

”بیگم ہر طرح کے اخلاق حسنہ سے آراستہ تھی ایسی قابل ہستیاں عورتوں میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ بیگم نے جس طرح اکبر اور شہزادہ سلیم کے درمیاں غلط فہمیاں دور کرائیں اسی طرح بادشاہ جہانگیر کو چارنا چار بیگم کے سمجھانے پر مرزا کو کلتاش کی خطا بخشی پڑی، بیگم میں خصال حمیدہ قدرت نے بہت عطا کیے تھے۔ اس کے ساتھ وہ زیور شاعری سے بھی آراستہ تھی مورخین نے اس کی سخن سنجی اور نکتہ فہمی کی بڑی تعریف کی ہے اور کتب تاریخ میں اس کا یہ مندرجہ ذیل شعر درج ہے: ۷

”کاکلت رامن زمستی رشتہ گفتہ ام

مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام“

زباں کی سلاست بیاں کی ندرت الفاظ کی جہتگی فقروں کی بے ساختگی اور بندش کی چستی نے شعر کو سحر حلال بنا دیا ہے۔ بیگم کا محقق تخلص تھا۔

منتخب التواریخ اور لب التواریخ کے مصنفین نے سلیم سلطان بیگم کے سیاسی شعور اور ذہانت کی تعریف کی ہے۔ جہانگیر خود بھی بیگم صاحبہ کی بڑے خوبصورت انداز میں تعریف کرتا ہے وہ تزک میں تحریر کرتا ہے۔

”یہ جمیع صفات حسنہ آراستگی و اشتند“ در زمان این مقدار

ہنر و قابلیت کم جمع می شود۔“

بیگم بے حد ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ اپنے عہد کی معروف شاعرہ تھیں۔ مآثر الامراء آئین اکبری اور اقبال نامہ جہانگیری کے مورخین نے بیگم کا تخلص مخفی لکھا ہے مگر مخزن الغرائب کے مؤلف نے اس کا تخلص نخلص بیان کیا ہے بیگم کا صرف ایک ہی شعر تذکروں میں نقل کیا ہے، جو بیان کیا جاسکتا ہے۔ بیگم کا ایک ذاتی کتب خانہ تھا۔ جس سے اس کے علمی و ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتب بینی کے شوق کے لیے یہ کتب خانہ کھولا تھا مخزن الغرائب صفحہ نمبر ۳۶۰ پر فیضی کے مرثیہ پر حسب ذیل رباعی درج ہے۔

فیضی مخوریں کہ دلت تنگی کرد باپاے امید عمر لنگی کرد

می خواست کہ مرغ رو بنید رخ دوست زیں واسطہ از نفس شب آہنگی کرد

یہ رباعی کا ملا بیگم کے ذکر میں نقل کی گئی ہے مگر بعض نسخوں میں تحریر ہے کہ یہ رباعی سلیمہ سلطان بیگم کی طرف منسوب ہے۔ (بحوالہ بزم تیموریہ جلد سوم ص ۲۲۱)

مآثر الامراء کے مصنف نے سلیمہ سلطان کا نام گلبرگ بیگم لکھا ہے۔ (جلد اول ص ۳۵)

جہانگیر تزک میں لکھا ہے ”والدہ ایشان گل رخ بیگم منیبہ حضرت فردوس مکانی بودند

ص ۱۱۳، بابر نامہ مرزا نور الدین کی نسبت کے بارے میں خاموش ہے گل بدن نے اس

تذکرے کو نظر انداز کر دیا جو ہر آفتابچی بھی مہربلب ہے۔ اکبر کے عہد کے کسی مورخ نے

بھی صاف ذکر نہیں کیا ہے۔ — مآثر رحیمی کے مصنف ملا عبدالباقی نے سلیمہ سلطان

کی والدہ کا نام گل رخ بیگم ہی تحریر کیا ہے۔ سلیمہ سلطان کا شجرہ والدہ کی طرف سے بابر

اور والد کی طرف سے خواجگان سے ملتا ہے جو صاحب نسب بزرگ تھے بیگم کی ولادت

کے بارے میں قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۵۳۹ء یعنی شوال ۹۴۸ھ کو پیدا ہوئی اس کی

تعلیم و تربیت کے لیے سلیقہ مند استانیباں مقرر کی گئیں جنہوں نے تمام علوم مروجہ سے طاق کر دیا۔ بہت سی شریف زادیوں نے اسے مذہبی مسائل اور خانہ داری سکھائے۔ فنون لطیفہ اسے اپنے نانا بابر سے وراثت میں ملے علم ہیئت، علم ریاضی میں بھی ماہر تھی۔ سلیم سلطان بیگم خدیجہ الزمانی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ سلیقہ شعاری اور پاکدامنی کی مجسم تصویر اور مذہبی مسائل کی جیتی جاگتی مورت تھی۔ اس میں حرم تیموریہ خاتون کی سب ہی خوبیاں تھیں۔

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضِ داری

آنچہ خواباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کم سنی کے عالم میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تمام نگہداشت اس کی والدہ گل رخ بیگم نے کی ۱۹ سال کی عمر میں ہمایوں نے بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خانا سے شادی کی تقریب جالندھر میں بڑی شان سے ادا کی۔ یہ شادی سیاسی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی جس طرح شیر شاہ سلطنت کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ اسی طرح بیرم خاں سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔

ملکہ بانو بیگم

ملکہ بانو مرزا غیاث (اعتماد الدولہ) کی دختر اور آصف خاں اور نورجہاں کی حقیقی بہن تھیں۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر جہانگیر نے ملکہ بانو کی شادی سید عبداللہ سیف خاں سے کرادی۔ سید عبداللہ سیف خاں سادات بارہ میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ سید عبداللہ سیف خاں نورجہاں کا حامی اور شہریار کا طرفدار تھا۔ اس بات پر میاں سے ملکہ بانو کا اختلاف تھا۔ لیکن ملکہ بانو نے فرائض زوجیت کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا اور شوہر کے حکم کو بحسن اخلاق انجام دیتی رہی آج کل کی بیویوں کے لیے ملکہ بانو کی زندگی ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔ ملکہ بانو ہمیشہ اپنے سرتاج کی تعریف کرتی رہتی تھیں وہ بخوبی واقف تھیں کہ عورت کی عزت شوہر کے ہی دم سے ہوتی ہے۔ خاوند کا گھر عورت کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا۔ یہ اس وقت کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ مغرب کی ملمع کاریوں اور مادہ پرستانہ تہذیب کی مکر چاندنی نے ہمارے زیورِ تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو حسن اخلاق، دین داری اور نیک خصائل سے دور کر دیا ہے۔

گلبدن بیگم، مریم مکانی، نورجہاں ممتاز محل، ملکہ بانو، زیب النساء بیگم وغیرہ خواتین کی زندگی سے ہماری خواتین سبق حاصل کر سکتی ہیں۔ پنجہ بیگم نورجہاں کی سگی بہن تھیں جس کے شوہر نواب قاسم اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔

۲۸ صفر ۱۰۵۰ھ کو سید عبداللہ سیف خاں کے انتقال کے بعد ملکہ بانو کی خوشی اور عیش و آرام ختم ہو گیا وہ آگرہ سے لاہور چلی گئی بقیہ زندگی عبادت و ریاضت میں گزاری اور ۱۰۵۸ھ میں ملکہ بانو نے وفات پائی۔ جہانگیر خود آصف خاں کے محل تشریف لائے، قرآن خوانی اور فاتحہ کا اہتمام کیا گیا۔ ملکہ بانو کا مقبرہ اعتماد الدولہ کے

مقبرہ میں واقع ہے۔ ملکہ بانو بھی نور جہاں کی طرح حسین و جمیل اور سلیقہ مند خاتون تھی وہ بہت ہی نیک، دین دار شوہر پرست تھی اور شوہر کی اطاعت کو اپنا ایمان سمجھتی تھی۔ ملکہ بانو بھی غریب اور یتیم بیکس و مجبور لڑکیوں کی پرورش کو اپنی ذمہ داری مانتی تھی۔ وہ بہت ہی رحمدل خاتون تھی۔

جاناں بیگم

جاناں بیگم بیرم خاں کی بیٹی اور عبدالرحیم خانِ خانان کی ہمیشہ تھی۔ یہ بہت ہی عقلمند اور دانشمند خاتون تھی تعلیم یافتہ خواتین اور استاد شاعرات میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ سخن وری اور طباعی لحاظ سے وہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی اس کا مشہور شعر ملاحظہ ہو :

”عاشق ز خلق عشق تو پہاں چسپاں کند

پیدا است از دو چشم ترش خوں گریستن“

اس شعر سے جو جہتگی اور شیوا بیانی اور شاعرہ کی قدر الکلامی اور زہد و بیانی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں۔ جاناں بیگم کے حسن و جمال کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی۔ بیرم خاں کی اکلوتی بیٹی بہت نیک سیرت خاتون تھی وہ فطرتاً علوم و فنون میں بہت دلچسپی رکھتی تھی اس نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔ اس مقدس کام کے صلہ میں اکبر اعظم نے ۵۰ ہزار دینار عطا کیے اور اس تفسیر کو بہت ہی آرزو مندی سے اپنے کتب خانہ میں جگہ دی۔

جاناں بیگم کی شادی اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال سے ہوئی۔ جاناں بیگم اپنے حسن و اخلاق اور فیاض دلی کے لیے بہت مشہور تھی وہ فقراء اور مشائخ سے بہت عقیدت رکھتی تھی اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتی تھی۔ اس کی شادی بہت ہی سادہ طریقہ سے ہوئی، اس نے خود فضول رسومات کو ختم کر دیا۔ پھر بھی بیرم خاں کی



۱۵۱۵

اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے شادی میں دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد جب نور الدین محمد جہانگیر تخت نشین ہوا تو جہانگیر نے جاناں بیگم سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس وفات و عفت مآب خاتون نے اس کے جواب میں اپنے پورے دانت نکلوا کر اور زلفیں ترشوا کر جہاں گیر کی خدمت میں پیش کیا۔ جہاں گیر عفت و حیا کا یہ نمونہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور جاناں بیگم سے پھر بھی نکاح کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

زندگی کے آخری دنوں میں جاناں بیگم حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئیں آخر کار میں وفات پائی اور اپنے پسماندگان سے ہمیشہ کے لیے مفارقت کر کے جدائی کا دردناک داغ دے گئی۔

جاناں بیگم کے کلام کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو؟

خیز تارہ برہ گزار کنیم خوش را چشم انتظار کنیم
ز راہ امن و سلامت بادبرد غبار تانشو و خاک پایا د نرسد

(بحوالہ بزم تیموریہ جلد سوم ص ۲۲۳، مژاة العالم ص ۳۵)

ستی النساء

”پہلو نشین تاج“

ایران کے معروف علاقہ نائندران کے شہر آمل جو شہر آفاق یعنی بلبلوں کے شہر کے نام سے مشہور ہے سستی النساء اسی شہر کی رہنے والی تھی سستی النساء کا خاندان اپنی قابلیت اور علمیت میں بے حد شہرت رکھتا تھا۔ طالبِ آملی ان کا چھوٹا بھائی دربارِ جہانگیری سے تعلق رکھتا تھا۔ سستی النساء کی شادی حکیم نصیر اے کاشی سے ہوئی۔ رکنائے کاشی۔ اپنے دور کے زبردست عالم فاضل اور مشہور شاعر تھے۔ دونوں بھائی اپنی ہم شیر سستی النساء کو دل و جان سے پیار کرتے تھے۔

ستی النساء اپنے بھائیوں کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھی ایک بار سستی النساء اپنے بھائی سے ملنے آگرہ بھی آئیں ۱۲۶۱ء میں طالبی کے انتقال کے بعد سستی النساء پریشانیوں میں گھر گئی۔

”حوادث کی ان صبر و آزماں اور حوصلہ شکن تیز و تند آندھیوں سے اس کا عیش و آرام بالکل منقض ہو گیا“

اب سستی النساء نے وطن سے ممتاز محل کے آستانِ فلک نشاں کا رخ کیا بیگم اس کی لیاقت سے متاثر ہوئی اور سستی النساء کو محل میں ملازمت مل گئی، سستی النساء تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی۔ قرآن پاک کی حافظ تھی۔ امورِ خانہ داری میں بھی مہارت رکھتی تھی۔ علمِ طب سے بخوبی واقف تھی۔ ممتاز محل اس کی دین داری و دیانتداری، سلیقہ شکاری، خوش اسلوبی، فرائض منصبی سے بہت خوش تھی اس لیے سستی النساء کو مہر داری، شاہی محل کے اہم کاموں اور جہاں آرا کی تعلیم و تربیت کو بھی سپرد کیا اور سستی النساء ان کاموں کو بخوبی انجام دیتی رہی۔

بد نصیبی اس بات کی تھی کہ سستی النساء کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ طالبِ آملی کی دونوں بیویوں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔ تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے ایک کی شادی عاقل خاں اور دوسری

حکیم ضیاء الدین سے کر دی۔

۱۶۴۷ء میں سستی النساء کی چھوٹی بھتیجی کی اچانک موت سے اس پر غم کے بادل ٹوٹ پڑے اسی دوران گلے کے درد سے دل کی حرکت بند ہو گئی اور سستی النساء بیگم اس دنیا سے ہمیشہ کو رخصت ہو گئی۔ سستی النساء کا روضہ تاج محل کے مغرب کی جانب جلو خانہ کے متصل ہے جو تاج گنج کا علاقہ کہلاتا ہے۔

عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ :

”ستی النساء خانم اپنی کاروائی، شیوہ بیانی، شناسائی آدابِ بندگی و رسوم خانہ داری اور فنِ طب میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ملکہ مختار الزمانی کی مغربِ خاص تھی وہ علیم قرآن سے اچھی طرح واقف تھی۔ قرآن کریم نہایت ترتیل سے پڑھا کرتی تھی اور فارسی نظم و نثر پر پوری طرح قادر تھی۔“ (شاہجہاں نامہ جلد دوم ص ۶۲۹)

ستی النساء کی پوری زندگی اس کے کردار اور علمیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ خانم جیسی خاتون پورے محل دور میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس کا تقدس حیات و یا انتداری قابلِ فخر ہے اور آج کی عورتوں کے لیے اس کی حیات اور کام سبق آموز ہیں۔

دلرس بانو بیگم :-

دلرس بانو بیگم کے والد شاہ نواز خاں صفوی اپنے عہد کے معروف آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی اس ہونہار خوش نصیب لختِ جگر کو ہر طرح کی تعلیم تربیت سے آراستہ کیا۔ اتنی ماہِ پیکر کہ چہرہ پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ دلرس فصاحت و بلاغت میں مثال نہیں رکھتی تھی۔ یہ جنت کی حورِ عیب پروری اور سکین نوازی میں کافی مشہور تھی، دلرس بانو بہت ہی بہادر و حوصلہ مند اور نسوانی خوبیوں سے بھرپور تھی، انھیں خوبیوں سے متاثر ہو کر اور نگ زیب نے اپنی زوجیت میں لیا۔ دلرس کے بطن سے پانچ اولادیں پیدا ہوئیں۔ دولڑکے محمد اعظم اور محمد اکبر جو بہت ہی بہادر تھے اور تین بیٹیاں تھیں۔

زیب النساء بیگم، زینت النساء بیگم اور زہدۃ النساء بیگم۔

بائی بہوت دی

یہ خاتون راجہ کشنور کی لاڈلی بیٹی اور اورنگ زیب کی بیوی تھی۔ زندگی کے حالات معلوم نہیں
اننا ضرور ہے کہ بیگم بہت ہی شائستہ مہذب اور بااخلاق خاتون تھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اورنگ زیب
تک اس خاتون کی کس طرح رسائی ہوئی۔

بی بی بائی :-

یہ خاتون شیر شاہ کی بھتیجی اور سلیم شاہ کی بیوی تھی۔ اس کا نام ماہی بائی بھی لکھا ملتا ہے۔
تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری میں صرف بائی لکھا ہے۔ بہر حال یہ خاتون بہت ہی معزز خاندان سے
تعلق رکھتی تھی جب اس کے سگے بھائی نے اس کے شوہر اور بیٹے کو قتل کر دیا تو یہ غم میں ڈوب گئی۔
اور روتی روتی ہی اس دنیا سے جدا ہو گئی۔

رضیۃ النساء بیگم :-

رضیۃ النساء بیگم شہزادہ محمد اکبر کی بیٹی اورنگ زیب عالمگیر کی پوتی تھی۔ یہ خاتون بھی
اپنی سخاوت اور فیاض دلی کے لیے مشہور ہے یہ نیک بندی بہت ہی غریب پرور مزاج تھی۔ زندگی
کی عاقبت سدھارنے میں ہمیشہ ہی سادہ زندگی بسر کی ۱۶۱۷ء میں شوہر کے انتقال کے بعد شہزادی بھی
عرصہ بعد اس دنیا سے فانی سے کوچ کر گئی۔

نواب زبدۃ النساء بیگم :-

نواب زبدۃ النساء بیگم زیب النساء کی حقیقی ہمشیر اور اورنگ زیب کی نیک بخت دختر
تھی۔ بیگم دہلوی کے بطن سے ۱۰۶۱ھ میں پیدا ہوئی۔ عالمگیر کی اس لخت جگر کی شادی داراشکوہ
کے بیٹے سپہر شکوہ سے ہوئی تھی۔ نواب زبدۃ النساء بیگم کی شادی سپہر شکوہ سے شاہجہاں نے

اورنگ زیب سے بصد ہو کر کرائی تھی۔ والد کے اسرار پر عالمگیر بخوشی رضا مند ہو گیا اور اپنی جہتی بیٹی کا نکاح داراشکوہ کے بیٹے سے کر دیا اور پرانی سب نجشوں کو بھلا دیا۔

سلیمہ بانو بیگم :

شہزادی سلیمان شکوہ کی بیٹی اور داراشکوہ کی پوتی تھی یہ عصمت مآب عقل و دانش میں شہزادہ آفاق ثابت ہوئی۔ سلیمہ ایسی نیک سیرت اور حسین صورت شہزادی تھی کہ خاندان کے سب لوگ اس سے پیار کرتے تھے داراشکوہ کو بھی سلیمہ بانو بیگم دل و جان سے عزیز تھی وہ اکثر شہزادی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سلیمہ بانو بیگم اپنے والدین کے انتقال کے بعد گوہر آرا بیگم کے پاس رہنے لگی۔ والدین کی محرومی سے سلیمہ بانو بیگم کے لیے یہ دنیا تاریک ہو گئی۔ زندگی کی ہر سرت نے منہ چھپایا۔ دنیا کی ہر نعمت سے محروم زندگی بے لذت نہ کوئی، ہنسی نہ خوشی، چاروں طرف بے کیفی اور اُداسی نظر آتی تھی۔ دنیا کی ہر لذت اس کی آنکھوں کا کانٹا بن گئی دن رات رو رو کر بسر ہونے لگی۔

غم و یاس میں ڈوبی اس مجسم تصویر کو اورنگ زیب نے ایک دن اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ ”تم اس طرح سلیمہ کب تک روتی رہو گی بیٹا ! اب تم مجھے اپنے باپ کی جگہ اور گوہر آرا کو اپنی والدہ کو قائم مقام سمجھو اور یقین کرو کہ مجھے تم سے نہ صرف اب بلکہ مرتے دم تک وہی محبت اور تعلق و اتحاد رہے گا۔ جو ایک نہایت شفیق و مہربان اور ناز بردار باپ کو اپنی ہونہار اولاد سے ہوتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور انشاء اللہ میں اپنے وعدہ میں سچا ثابت ہوں گا۔ جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے تمہیں کسی طرح بھی زحمت و تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔“ اس تقریر کا سلیمہ بانو بیگم پر بہت اثر ہوا، اور اورنگ زیب کو بھی بہت صدمہ پہنچا محبت اور جوش میں سکتہ کی کیفیت تاری ہو گئی، زار و قطار روتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے بعد عالمگیر نے سلیمہ بانو بیگم کی شادی اپنے چھوٹے شہزادہ اکبر سے کر دی، یہ شہزادہ بھی دہلی کے لٹن سے پیدا تھا۔

۱۔ بیگمات خاندان تیموریہ ص ۷۷

جانی بیگم :

آئی بیگم اورنگ زیب کے ممتاز جنرل نجابت خاں کی چہیتی بہن تھیں اورنگ زیب
آئی بیگم کو شہزادیوں کی طرح چاہتا تھا۔ زیب النساء بھی آئی بیگم کی بہت عزت کرتی تھیں۔ آئی بیگم
ذی علم اور بہت خوبصورت اور نیک سیرت اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ آئی بیگم نے ۱۰۸۸ء
میں وفات پائی۔

عظمت النساء بیگم :-

یہ امیر تیمور کی تیسری بیوی تھیں۔ یہ پری جمال خاتون بنارس کے ایک برہمن کی بیٹی تھیں
جنگ میں اس کے والد چچا اور بھائی سب مارے گئے تو عظمت النساء امیر تیمور کی قید میں گرفتار
ہو گئی۔ اس کا اصلی نام جینی تھا۔ امیر تیمور جینی کی خوبوں سے ایسا متاثر ہوا کہ جینی سے شادی کر لی
اور عظمت النساء کا خطاب دیا، زندگی اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔

اختر زمانی بیگم :-

اختر زمانی بیگم کے دل پر دنیا کے کچھ حادثات نے ایسا اثر کیا کہ وہ دنیاوی امور سے
بے نیاز ہو گئی اختر زمانی کے حالات زندگی کے بارے میں تاریخ خاموش ہے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ
وہ علوم و فنون سے آراستہ تھیں بہت ہی ذہین اور غریب پرور نیک سیرت خاتون تھیں یتیموں کو
کھانا کھلانا زندگی کا مقصد بن گیا بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتی تھیں، علماء کی بہت قدر کرتی تھیں
تہجد گزار زاہدہ تھیں۔

آزم بیگم :-

یہ سیادت صفوی کی اکلوتی بیٹی تھیں، نہایت لائق اور فاضلہ خاتون تھیں اس کے والد

شاہجہانی دربار کے ممتاز امراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ باپ نے بیٹی کو تمام علوم سے آراستہ کیا تھا۔ گھڑسواری، تیراندازی، فنون جنگ میں ماہر تھی۔ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی لڑائی میں داراشکوہ کی طرف دار تھی۔ آرم بیگم کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے عالمگیر نے اپنے چھوٹے بیٹے کا تخت سے ۱۰۹۴ء میں شادی کر دی۔ شادی کے بعد باہر گھوڑے کی سواری باغوں کی سیر وغیرہ پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ اس کی اہلیت اور لیاقت کا کتنا بڑا مظاہرہ تھا کہ آرم بیگم نے اپنے اضطراب کا کبھی اظہار تک نہیں کیا۔ ایسی ہوتی ہے شوہر پرستی کی مثال، اس نے شوہر کی خوشنودی کو ہمیشہ مد نظر رکھا، اس کی زندگی آج کی بیویوں کے لیے ایک بے مثال درس ہے۔

فخر النساء بیگم :-

یہ امیر تیمور کی بیوی سینا کی رہنے والی اور عربی النسل کی خاتون تھی بچپن میں شادی قاہرہ کے امیر کبیر سے ہو گئی۔ مگر یہ رشتہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ پھر بیگم نے ایک لیفٹننٹ سے شادی کر لی مگر وہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد معلوم ک طرح سے فخر النساء بیگم امیر تیمور کی زوجیت میں آئی۔ یہاں اس کی قابلیت اور ذہانت کے جوہر سامنے آئے وہ بہت قابل اور خوبصورت خاتون تھی۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔ وہ نیک سیرت اور مذہبی خیالات کی خاتون تھی۔

سلطان بیگم :-

یہ خاتون شاہ طہاسپ فرماں روا نے ایران کی بیٹی تھی، جلاوطنی کی حالت میں جب ہمایوں ایران پہنچا تو سلطان بیگم نے ہی اپنے والد اور بھائی سے سفارش کر کے ہمایوں کی مدد کی پوری مغلیہ سلطنت سلطان بیگم کی اس امداد کا مقروض رہے گا۔ اگر سلطان بیگم جو نفس نفیس ہمایوں کی مدد تھی تو مغلیہ حکومت ہندوستان میں قائم ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

موتی بیگم :-

یہ شہنشاہ اکبر کے سب سے پہلی بیوی تھی، جو بہت ہی حسین و جمیل بیگم تھی مگر کچھ سخت مزاج تھی اسی لیے اکبر کے اور بیگم کے مزاج میں خاص فرق تھا۔ ۱۶۱۸ء میں موتی بیگم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

حاجی بیگم

یہ حسینہ اور پر جمال پرمی چہرہ خاتون ہمایوں بادشاہ کی بیوی تھی۔ حاجی بیگم حقیقت میں بڑی جاں باز، حوصلہ مند، بہادر عورت تھی۔ حاجی بیگم کا مقبرہ عرب سرائے کے متصل ہے۔

آرام جاں بیگم :-

یہ عصمت بے پناہ شریف خاتون نور الدین محمد جہانگیر کی پانچویں بیوی تھی جو بہت ہی حسین اور عقلمند خاتون تھی، آرام جاں بیگم اپنی حاضر جوابی اور شاعری کے لیے مشہور تھی۔ بیگم بہت ہی ذہین اور دانشور خاتون تھی۔ "بیگمات خاتون تیموری کے مصنف سید ظہور الحسن دہلوی نے بیگم سے متعلق ایک حکایت تحریر کی ہے جس کے مطابق - ملاحظہ ہو :-

"ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ ایک شہزادہ سے شرط نہج کھیلتے ہوئے چال میں پھنس گیا اور بازی ہارنے کی شرط یہ تھی کہ ہارنے والے کو اپنی بیگم نذر کرنی پڑے گی۔ جہانگیر جب بازی ہارنے والا تھا تو پریشان گھبراتا ہوا محل میں نور جہاں کے پاس پہنچا، نور جہاں چال بتانے میں قاصر رہی پھر حیات النساء کو طلب کیا مگر وہ بھی چال بتانے میں الجھ گئی۔ آخر میں آرام جاں جو شرط نہج میں مہارت رکھتی تھی۔ جب جہانگیر نے اس کو نقشہ سمجھایا تو آرام جاں نے اس شعر کے ساتھ چال کو سمجھایا۔

”شاہانہ دورِ نوح بدو دل آرام رامدہ
پہل و پیادہ پیش کس واسپ کشت مات“

اس شعر کو سمجھ کر جہانگیر نے چال چلی اور بازی جیت گیا۔ اندازہ لگائیے کہ آرام جاں بیگم کتنی ذہین تھی۔ اس کی ذہانت پر حیرت ہوئی ہے۔ اس شعر سے اس کی قابلیت اور ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا

آکبر آبادی یا عزیز النساء بیگم :-

آکبر آبادی بادشاہ شاہجہاں کی دوسری بیوی تھی، بیگم بہت ہی دلفریب نور کی پتلی اور پری چہرہ خاتون تھی، نزاکت اور صورت میں ملکہ رکھتی تھی۔ آکبر آبادی کسی بھی خوبی میں ممتاز محل سے کم نہیں تھی، رحم دل اور سخاوت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آکبر آبادی مذہبی خیالات کی خاتون تھی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد آکبر آبادی کا بادشاہ پر مکمل اثر رہا۔ شاہجہاں کے بعد ۱۲ سال بعد تک بیگم زندہ رہی مگر اس جیا کی دیوی اور پرچشم خاتون نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی عبادت میں زندگی بسر کی، چوتھی ذی الحجہ ۱۰۸۸ھ کو رگڑاڑے عالم بقا ہوئی۔ بیگم کی یاد کو قائم رکھنے کی غرض سے دہلی کے پاس فیض بازار میں اکبری بیگم کے نام سے ایک مسجد ایک مسافر خانہ اور طلباء کے لیے مکانات بنوائے، ان عمارات سے بیگم کی ذہنیت شعور اور حوصلہ مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا

آورنگ آبادی محل :-

یہ بیگم اورنگ زیب کی چوتھی بیوی تھی، اس کے حسن و جمال اور عقلمندی نے اورنگ زیب پر اپنا اثر جمایا تھا۔ اکثر معرکوں میں اورنگ آبادی محل اورنگ زیب کے ساتھ رہی۔ اورنگ زیب بیگم کی خوبیوں سے متاثر تھا۔ بیگم کے وطن سے صرف ایک لڑکی مہر النساء بیگم تھی جو بہت ہی ذہین اور حسین تھی شاہی محل کی بیگمات کو مذہبی مسائل کے درس دینا اور دیگر مسائل کو حل کرنے کے فرائض کو انجام دینا اورنگ آبادی محل کے سپرد تھے۔ ۱۱۱۶ھ میں بیگم صاحبہ نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ بیگم کی یاد میں پنجابی کڑہ دہلی میں ایک شاندار مسجد سنگ مرمر کی تعمیر کرائی۔

بائی اودے پوری :-

یہ خاتون راجہ اودے پور کی بلند اختر اور نیک دختر تھی، وہ بہت ہی دلیر اور بہادر خاتون تھی سپہ گری میں ماہر تھی، ہتھیاروں کو چلانے کا ہنر آتا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر باغوں کی سیر کو جاتی تھی۔ اس کے حسن کی تعریف اس زمانے کے مورخین نے بھی کی ہے، ان سب خوبیوں سے متاثر ہو کر عالمگیر نے بائی اودے پوری کو شریک حیات بنالیا۔

اشرف زمانی :-

اشرف زمانی کے والد محترم کابل کے باشندے تھے اور وہ سردار کے عہدہ پر رہ چکے تھے اسی لیے اُن کو کابلی سردار کہا جاتا تھا۔ ان کی دختر اشرف زمانی بہت ہی نیک سیرت اور حسین صورت کی خاتون تھی وہ تعلیم و تربیت سے مکمل طور پر آراستہ تھی۔ اورنگ زیب نے جب اشرف زمانی کی خوبیوں کے بارے میں بیگمات سے سنا تو اپنے بیٹے شہزادہ بہادر شاہ کی شادی اشرف زمانی سے کر دی۔ اشرف زمانی کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں۔

رحمت بانو بیگم :-

اس شریف عقلمند اور پاکدامن خاتون کے والد محترم کا نام زربان آسام تھا۔ رحمت بانو بیگم کے حالات کے بارے میں تاریخ خاموش ہے، اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد عظیم کی شادی رحمت بانو بیگم سے ہوئی، رحمت بانو بیگم نے شاہی حرم کی بیگمات کو اپنی خوبیوں سے متاثر کر لیا تھا۔

جانی بیگم

جانی بیگم کی زندگی کے حالات نہیں معلوم ہو سکے اتنا ضرور ہے کہ جانی بیگم بے حد حسین

اور ذہین خاتون تھی اور تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی وہ بہت خوش مزاج خاتون تھی۔ اور نگ زینے اپنے بیٹے محمد اعظم سے جانی بیگم کی شادی کر دی۔

امتہ الحبیب بیگم :-

یہ معزز اور نیک سیرت حسین صورت خاتون محمد معظم شاہ عالم بہادر غازی بادشاہ بن عالمگیر کی عزیز اور چہتی بیگم تھی امتہ الحبیب کے حسن و جمال کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں امتہ الحبیب جیسی دانشور عقلمند اور ذہین خاتون کی مثال ایشیائی ممالک میں ملنا بڑا مشکل تھا۔ بیگم کی یہ بڑی خوبی تھی کہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد رحمدل تھی وہ تمام ملازمین کو اولاد کی طرح سمجھتی تھی۔ تمام مورخین نے امتہ الحبیب کی مردانگی، شجاعت، ہمت، حوصلہ مندی اور استقلال کا تذکرہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امتہ الحبیب بیگم میں حمیدہ بانو بیگم جیسے تمام اوصاف ملتے تھے۔

ارہم یاقدسیہ بیگم :-

یہ زہرہ جبین خاتون محمد شاہ کی بیگم تھی جو نہایت عیش و نشاط میں غرق تھا قدسیہ بیگم بھی بہت ہی حسین خاتون تھی۔ بیگم کو شاعری سے بے حد دلچسپی تھی، اس شاعری کے ذوق کا اندازہ ہمیں اس کے شعر سے ہوتا ہے وہ کہتی ہے کہ :

”ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا۔

کبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا“

شوہر کے انتقال کے بعد قدسیہ بیگم نے دہلی میں قدسیہ نام کا باغ لگوایا جو بہت ہی خوبصورت باغ تھا۔ اس باغ میں ایک مسجد اور بارہ دری بھی تعمیر کرائی، کبھی یہ عمارت اور باغ ہندوستان میں اپنا مقام رکھتے تھے۔

چاند بی بی

رناورۃ الزمانی

کس غضب کی بونگھتی ہے ترے پیغام سے

ہندوستان کی غیر فانی ہستیوں میں چاند بی بی کا نام ممتاز درجہ رکھتا ہے اور مادر وطن کی نسوانی فضا میں ہمت و دلاوری کی گونج پیدا کر رہا ہے چاندی بی بی کے کارنامے زیریں لفظوں میں ہندوستان کے دل پر لکھے جا چکے ہیں۔ بقول مولانا علم الدین :

”چاند بی بی کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبان حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کے وہ کمزور بازو اور نازک ہاتھ جو شیر خوار بچوں کو ہینکھوڑہ ہلایا کرتے ہیں کبھی کبھی وہی ہاتھ قوموں سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ بھی کیا کرتے ہیں نیز عورت کے عزم اور ارادے کے مقابلے میں جبری سپاہیوں کی دلیری فوجوں کی کثرت توپوں کی آتش بازی اور شاہانہ جاہ و جلال بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے بلکہ

چاند بی بی کے والد نظام حسین شاہ ولے احمد نگر تھے چاند بی بی کی والدہ خدیجہ سلطان اپنے دور کے عقل و تدبیر اور جاہ و جلال کی زندہ تصویر تھیں۔ چاند بی بی نے اسی لائق ماں کے اسغوش میں تعلیم و تربیت پائی چاند بی بی ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوئی۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت دکن کی پانچویں ریاستیں آپس میں دست گریباں ہو رہی تھیں، چاند بی بی فنون جنگ میں بھی ماہر تھیں اور بہترین شہسوار اور بہادر سپاہی تھیں شمشیر زنی میں بھی ملکہ رکھتی تھیں۔ وہ ہمیشہ شوہر کے ساتھ رہتی تھیں اور دونوں میں بے پناہ خلوص و محبت تھی مگر ملال یہ تھا کہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ رنج و غم میں ڈوب گئی تمام سدطنت میں

چاند بی بی



چاند بی بی

شازشوں کے جال بٹنے جا رہے تھے اور امن و امان بھی خطرے میں پڑ گیا۔ نو ساں کے بھتیجے کی سرپرستی کمر تے ہوئے سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ اس پاک دامن عقیقہ نے تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اس نے ایک بار امراء کے سامنے اعلان کیا کہ :

”اگر نا اتفاقی کا بیج بو دیا گیا تو اس کا پھل تباہی ہوگا۔ اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری خانہ جنگی سے بیجا پور کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ سلطنت کے دشمن جو موقع کی تاک میں بیٹھے ہیں سلطنت کو مردہ لاش سمجھ کر گدھوں اور چیلوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے اور ایک دن آئین واحد میں اسے مٹا کر رکھ دیں گے“

چاند بی بی کے خلاف ہر روز نئی نئی سازشیں ہوتی رہیں اور امراء میں باہمی اختلافات پیدا ہوتے رہے ایک موقع پر چاند بی بی پر الزام لگا یا کہ وہ بیجا پور کی خفیہ باتیں احمد نگر پہنچاتی رہتی ہیں۔ احمد نگر میں چاند بی بی کے رشتہ داروں کی حکمرانی تھی آخر کار ایک دن چاند بی بی کو اسی الزام میں گرفتار کر کے ستارہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور اس کی کنیزوں کو برہنہ کر کے شہر کے باہر نکال دیا۔ مگر جب ان لوگوں کو بے گناہی کا علم ہوا تو کشور خاں نے چاند بی بی کو قلعے سے باہر نکال لیا۔ مجبور ہو کر چاند بی بی نے اب ہاتھ میں تلوار لے لی اور جان کی بازی لگا کر دشمنوں کا مقابلہ کیا، کچھ دن بعد دشمنوں نے بیجا پور پر دھاوا بول دیا۔ چاند بی بی نے جم کر میدان میں مقابلہ کیا۔ آخر میں دشمن کو شکست فاش ہوئی اس طرح بی بی نے بیجا پور کے سپاہیوں میں ایک نیا حوصلہ اور جوش بیدار کیا۔ ’کس غضب کی بونکلتی ہے ترے پیغام سے‘

بیجا پور دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا، جگہ جگہ عمارات مساجد، خوبصورت محل، تفریح گاہیں بنوائی گئیں اور دیکھتے دیکھتے بیجا پور ایک عالیشان شہر بن گیا۔ چاند بی بی نے والیئے احمد نگر سید مرفعی نظام جو بی بی کا بھائی تھا۔ اس کی شادی ابراہیم کی ہمیشہ سے کرا دی یہ شادی سیاسی اعتبار سے مفید ثابت ہوئی اور دونوں ریاستیں اتحاد کے رشتہ میں بندھ گئیں پھر چاند بی بی احمد نگر چلی گئیں اور انھیں اب سیاسی زندگی سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ چاند بی بی نے کہا کہ :

”دنیا خیر و شر کی رنگینوں اور رنج و راحت کے کمرشموں کا تعجب انگیز مجموعہ ہے جس کے حبیب و دامن طرح طرح کے تغیرات و انقلابات سے ہر وقت معمور رہتے ہیں سیاست ایک ایسا سراب ہے جس کے دعوے میں مبتلا ہو کر پریشانی رسوائی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، سیاسی آدمی کی شہرت بے بنیاد ہوتی ہے سیاسی جوڑ توڑ کا نتیجہ جھوٹی واہ واہ اور مصنوعی خوشی ہوتی ہے اور سیاست دانی کا انجام ضمیر کشی اور ایمان فروشی ہے سیاسی تدبیر کبھی تو کامیابی کے پروں پر اڑ کر قوق السما تک جاتا ہے کبھی ناکامی کا شکار ہو کر تخت السری میں پٹخیاں کھاتا دکھائی دیتا ہے اگر اس کے حلق میں شیرینی کا ایک لقمہ پہنچتا ہے تو اس میں زہر کی سوتلیاں بھی شامل ہوتی ہیں اس کے دامن سے صبح عیش طلوع ہوتی ہے لیکن افق سے شام کدورت بھی اپنا بھیانک چہرہ دکھاتی ہے۔۔۔۔۔ تمام عمر سناروں سے کھپول چننے شبہم سے کنواں بھرنے اور پانی کے ببلوں سے دامن پر گرنے میں ضائع کر دی ہے اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں ملکی سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں اور اللہ اللہ کر کے آرام و اطمینان کا سانس لوں“

احمد نگر آکر چاند بی بی نے خاندانی رنجش اور خانہ جنگی دیکھی، بی بی سے نہ رکا گیا پھر سیاسی میدان میں اترنا پڑا۔ پیرانہ سری میں بھی چاند بی بی کے عزائم جواں تھے۔ وہ مورچوں کا معائنہ، فوجوں کے قواعد، قلعوں کا انتظام، لشکروں کی نقل و حرکت جنگ کے سامان و رسد کا بند و بست غرض ہر چیز کی دیکھ بھال خود کرتی تھیں بی بی احمد نگر کے قلعے کو مضبوطی سے سد سکندری بنایا۔ ایک بار ۱۵۹۵ء میں جب شہزادہ مراد اور خانخانا احمد نگر پر حملہ کرنے کی غرض سے پہنچے تو چاند بی بی نے شہزادہ کو پیغام بھیجا کہ ”اگر صاحب عالم سلطنت احمد نگر کے دوست بن کر آئے ہیں تو بسر و چشم تشریف لائیں نظام شاہنہ سلطنت کا ایک ایک فرد خدمت گزاری کے لیے موجود ہے اور اگر صاحب عالم کی نیت فاسد ہے اور ملک گیری کا جذبہ انہیں یہاں لایا ہے تو ہمیں میدان و ہمیں چوگان تلوار خود اس چیز کا فیصلہ کر دے گی کہ اصل حقدار کون ہے۔“

چاند بی بی نے احمد نگر کے امیروں کو ایک بار پھر ہوشیار کیا کہ "ان کی نا اتفاقی کا گناہ ملک و سلطنت کو تباہ کر دے گا۔ احمد نگر تیموریہ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو جائے گا اور ان کے اہل و عیال کو بوندی و غلام بنالیے جائیں گے۔ جہاں نظام شاہانہ سلطنت کا پرچم لہراتا ہے وہاں اکبری علم اڑنا دکھائی دے گا۔ ان کی عزت اسی میں ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت کے اثر سے ہمیشہ آزاد رہیں اور اپنے کندھوں پر غلامی کا جوا نہ پڑنے دیں۔" بی بی کی اس تقریر کا امراد پر گہرا اثر ہوا۔

آخر کار مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا چاند بی بی نے ہمدان میں بہت بہادری سے مقابلہ کیا دشمن کے چھٹکے چھڑا دیے اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ شہزادہ جو خود بہادر تھا اور بہادروں کی قدر کرتا تھا چاند بی بی کی بہادری دیکھ کر اس کا مداح بن گیا۔ بی بی بہت ہی دلیر شیر دل بہادر اور مجاہدہ خاتون تھیں شہزادہ نے چاند بی بی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ :

"آپ میں وہ اوصاف ہیں جو ایک بہادر سلطان اور بیدار حکمران میں ہوتے ہیں اور آپ ملک کی حقیقی خیر خواہ ہیں۔"

اس کے بعد چاند بی بی کو چاند سلطان کے نام سے ہر خاص و عام پکارنے لگا۔ تیموری مورخ اسے بیگم سلطان کے لقب سے یاد کرتے ہیں مغلوں نے احمد نگر سے فوجیں بٹالیں اور برابر پر قبضہ کر لیا تو ایک بار پھر اندرونی حالات کی بنا پر احمد نگر کا نظام درہم برہم ہو گیا اور حمید خاں نے چاند بی بی کو قتل کر دیا۔ بی بی صاحبہ مکران، اجمیر، انگلستان کی سمعہ تھی اور سیاسی شعور میں کسی سے کم نہیں تھی وہ خوشامد پسندی سے نفرت کرتی تھی خود اعتمادی پر تعین کرتی وہ بہت ہی ذہین اور بیز فہم خاتون تھی وہ پاک دامن قدسی صفت اور اعلیٰ اخلاق کی خاتون تھی اس نے اپنی جنگی سرگرمیوں کی صفویات کے باوجود میدان جنگ تک میں پردہ نہیں چھوڑا اور چہرہ پر نقاب پوش میدان میں اترتی تھی وہ رحم دل نوع انساں سے بے حد ہمدردی رکھتی تھی اس میں مادر وطن کی محبت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے پڑے تھے۔

چاند بی بی کی تقریر میں جادو کا اثر تھا۔ چاند بی بی نے ایک دفعہ پرجوش الفاظ میں کہا کہ :

"دشمن دروازہ پر کھڑا ہے تم خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو بجاپور دوسری ریاستوں

کے زیرِ نگیں ہو جائے گا اور یہی سہی وہ آزادی جو تمہیں زندگی سے زیادہ عزیز ہے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے اٹھو اور آزادی کے لیے مر مٹو۔

اپنی آن بان، شان پر مر مٹنا ایمان کا جز سمجھتی تھی وہ اسی لیے بڑی سے بڑی قربانی کو تیار رہتی تھی ایک واقعہ کے مطابق ایک دفعہ اس کے شوہر کے دشمن رات کو اس کے محل میں اس کے شوہر کو (علی عادل شاہ) قتل کرنے آ گئے، شوہر بے خبر سو رہے تھے۔ اور چاند بی بی۔ حفاظت کر رہی تھی شوہر کو جگائے بغیر چاند بی بی نے دونوں دشمنوں کو قتل کر دیا اس طرح اپنے شوہر کی جان کی حفاظت کی۔

ایسی قابلِ فخر بہادر خواتین روزِ روز کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت میں۔ احمد نگر کے شاہی خاندان کی شمع نے اسے حسن و ریاضی سے بخشا تھا۔ درمیانہ قد، ڈبلا پتلا مگر موزوں بدن، نیچھے نقشِ موٹی موٹی دلکش کاکریزی آنکھیں لمبی لمبی پلکیں پیوستہ ابرو بلند پیشانی غنچہ دیں سڈول اور شفاف دانت اور گلابی ہونٹ تھیں، وہ عربی اور ترکی زبان فصاحت کے ساتھ بولتی تھی کناری اور مرہٹی زبانوں پر بھی اسے خاصی دسترس تھی، مصحفی اور علم موسیقی کا بے حد شوق تھا گھوڑ سواری کی بڑی شائق تھی شوہر کے ساتھ ہمیشہ گھوڑے پر سوار سمراہ جاتی تھی اور شکار کے وقت شیر اور چیتے کی بھی پرواہ نہیں کرتی تھی۔

چاند بی بی نے احمد نگر اور بیجا پور کے درمیان رشتہ اتحاد قائم کیا۔ جنوبی ہند کی تمام شہزادیوں کو اپنا گرویدہ بھی کیا شوہر کو مطیع کیا اور رعیت کو تالیع فرمان بنایا، وہ اتنی خوش نصیب تھی کہ:

”نعم کے پر اس کے قریب آتے ہوئے جلتے تھے“



حضرت محل بیگم

بیگم حضرت محل (شانِ اودھ)

” ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے “

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بادشاہ بیگمات، راجے مہاراجے و ہر خاص و عام انگریز حکومت کے خلاف مقابلہ کے لیے کفن بردوش میدان میں اتر آئے بہادر اور جیالی خواتین میں بالخصوص بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی، دہلی کی سبز پوش عورت، عزیزن، جھانسی کی گم نام شہید مسلم خاتون وغیرہ نے ملک و قوم کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک زندہ قوم کی خواتین کے عزم اور حوصلے اس طرح کے موندنے ہیں انھوں نے اپنے مجاہدانہ کاموں سے مادرِ وطن کی مٹی کی خاطر وہ قرض ادا کیے جو ان پر واجب بھی نہیں تھے۔

” مٹی کی محبت میں ہم آشفۃ سروں نے — وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے “

ان بہادر اور غیرت مند خواتین کا نام ہندوستان کی تاریخ میں مجاہدین آزادی کی صفِ اول میں سنہرے الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ ان خواتین نے اپنی قربانی جرات و شجاعت کی وہ روشن مثالیں پیش کیں، جن کو ہندوستان کی تاریخ ہزاروں سال تک پیدا نہیں کر سکتی ان خواتین کے کردار زندہ قوم کے لیے حیرت ناک نمونے ہیں، ان خواتین نے یہ ثابت کر دیا کہ شہید کی موت قوم کی حیات ہوتی ہے ہر مصیبت کے نازک موڑ پر یہی ثابت کرتی ہیں کہ: تافلے شوق کے رکتے نہیں دیواروں سے

سیکڑوں مجلس و زنداں کے دیار آئے ہیں

بیگم حضرت محل کی سوانح اس پردہ نشین خاتون کی تاریخ ہے جو قوم و ملت کے لیے مجاہدانہ اور غیرت و حمیت، ایثار و قربانی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ اک جاں باز خاتون نے ہر فید و بند میں اپنی صلاحیت اور قابلیت کے جوہر دکھائے حقیقت میں حضرت محل کے کارنامے مسلم خواتین کے لیے درس دے رہے ہیں۔

بیگم حضرت محل کا اصلی نام محمدی بیگم تھا جسے بچپن میں امراؤ کے نام سے پکارتے تھے محمدی بیگم اودھ کی راجدھانی فیض آباد کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ہوش سنبھالتے ہی واجد علی شاہ کی شریکِ حیات بن گئی امراؤ۔ واجد علی شاہ کی محفلوں کے اندر سمجھا اور پری خانہ میں پہونچ کر مہک پری کے نام سے پکاری جانے لگی، مہک پری کے پہونچنے سے پری خانہ کی زینت کو چار چاند لگ گئے۔ واجد علی شاہ نے مہک پری کو افتخار النساء خانم کا خطاب عطا کیا اور واجد علی شاہ اس کی فہم و فراست، حسن و سیرت و صورت پر گرویدہ ہو گیا۔ اب داستان تاریخی منزلوں کو چھونے لگی۔ مہک پری کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے خود نوشت روزنامہ میں واجد علی شاہ رقمطراز ہیں:

وساطت جو امن امان نے دی میرے گھر میں آئی زن خانگی
پسینہ تھا خوشبو اس کا گلاب پری تھی مہک اس نے پایا خطاب
لگی ہونے تعلیم رقص و سرود شب و روز تقہیم رقص و سرود
پہلے تو مہک پری نے واجد علی شاہ کے پری خانہ میں رقص و سرود سیکھا اور پری خانہ کو حقیقت میں مہک پری نے اپنے بے پناہ حسن کے نور سے منور کر دیا اب پری خانہ نور کی محفل بن گیا۔ لیکن قدرت نے بیگم کو پری خانہ کی جھنکار میں غرق ہونے کے لیے نہیں بلکہ امراؤ کو اہل ہند بالخصوص اہل اودھ کو ایک نیا ساز ایک نئے نغمہ کے لیے پیدا کیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بیگم نے شہرت اور عزت حاصل کر لی اور ان کے وطن سے بڑھیں قدر کے پیدا ہونے سے ان کی عظمت اور بلند ہو گئی۔

بیگم حضرت محل مادرِ وطن کی وہ مایہ ناز بیٹی ہے جس پر ملک فخر کرتا ہے۔ بیگم نے اپنی شجاعت اور ہمت الوالعزمی اور دانشمندی سے عیار دشمن کا مقابلہ کیا جو جذبہ وطنیت سے حد درجہ سرشار تھی جس نے آزادی وطن کی راہ میں بخوشی اپنے عزیز ترین فرزند کی بازی لگادی۔ جس نے ہزار ہا آلام و مصائب برداشت کیے لیکن دشمن کے سامنے سرتسلیم خم نہ کیا۔ یہاں تک کہ ترک وطن پر مجبور ہو گئے اور بالآخر غریب الوطنی میں کشمکشِ زیست سے نجات

حاصل کی اس مجاہدہ کی آخری آرام گاہ کا ٹھنڈ و جو بیپال کی راجدھانی ہے میں اسی کی بنوائی مسجد میں ہے۔

۱۸۴۸ء میں جب واجد علی شاہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو سلطنت اودھ اپنے ایک اہم تاریخی موڑ پر آچکی تھی، حضرت محل کو نواب بیگم حضرت محل کا خطاب مل چکا تھا۔ بیگم ایک وفا شعار بیوی اپنے محبوب شوہر سے شاداں تھیں۔ اودھ میں اس وقت قوس قزح کے رنگ و نور کا ایک دریا موجزن تھا۔ لیکن رنگ و نور کے ان دھاروں کے پیچھے جو طوفان تیزی سے کمر وٹیں بدل رہا تھا وہ بیگم کی وقت شناس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا، ان کے حساس دل و دماغ نے اودھ کے ارد گرد سنہرے جال کو مضبوط تر ہوتے دیکھا اس وقت دربار اودھ سیاسی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی سرنگ تھی (ناسور بن چکی) تھی۔ عنان حکومت دراصل اودھ کے لیے تاج بادشاہ ریزیدینٹ کے ہاتھوں میں تھی اور شاہ اودھ کی حیثیت محض شطرنج کی بساط کے ایک لاچار مہرہ جیسی تھی۔

بیگم حضرت محل نے اودھ کے اقتدار کے مٹنے کے اس سیاسی المیہ کا بطور مطالعہ کیا اب بیگم نے ہندوستان کے سیاسی نقشہ کی سیما کی مانند بدلتی ہوئی حد بندیوں کا شعور سیاستداں کی عمیق نظروں سے مطالعہ کیا اور خود آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل ڈلہوزی تھا جس کی ویسی ریاستوں کی بے جا احمق کی پالیسی نے ملک میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ ۱۸۵۶ء کو اودھ کے احمق کا اعلان کرنے واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ کے میٹا برج بھیج دیا۔ کچھ بیگمات نواب صاحب کے ساتھ چلی گئیں اور کچھ قیصر باغ کے محلوں میں ہی مقید رہی۔

بیگم حضرت محل کے لیے یہ لمحہ بڑے صبر آزما کا تھا ایک طرف شوہر کی جدائی دوسری طرف وطن کی آبرو کی حفاظت کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ نے لکھنؤ پر آن پڑی پیتا کے تحفظ کے لیے آخری فیصلہ کیا۔

”یہ فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ تھا“ باشندگان اودھ بیگم کے اس فیصلہ کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے“

واجد علی شاہ کے بعد لکھنؤ میں بدسی جابر و غاصب حکمرانوں نے ظلم و تشدد کے وہ مظاہرے کیے جن کے تصور سے تاریخ انسانیت آج بھی کراہ اٹھتی ہے۔ ان حریص نظروں نے بیگم صاحبہ کو مختلف طرح سے نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے محمد خان اور دیوان ٹھاکر پرشاد کی مدد سے اپنی شان و شوکت پر حرف نہ آنے دیا اور کمپنی کی کبھی خوشامد نہیں کی۔ لکھنؤ کے ہر دل میں انگریزوں کے خلاف آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ مگر جب فریب اور بربریت کی سیاہ چادر نے یہاں کا سکون چھین ناچا تو اسی سرزمین سے ہزاروں جاں باز حریت پسند وطن کی آزادی اور قومی یک جہتی کا پرچم لے کر میدان میں اتر پڑے۔ شمع آزادی کے ان پروانوں کی رہبری بیگم حضرت محل نے کی۔ نہ تو اقتدار کی ہوس تھی نہ دولت کی طمع اب از سر نو نئی مملکت کی تشکیل کرنا تھا اسی لیے دشمن کو پسپا کرنا اصلی مقصد بنایا۔

۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو شہنشاہ بہادر شاہ کے وزیر کی حیثیت سے گیارہ سالہ برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا گیا اور بیگم حضرت محل مشیر خاص قرار دی گئیں۔ یہ بیگم کے لیے سخت امتحان کا وقت تھا۔ بیگم نے اپنی سیاسی بصیرت کا یہی نہیں ثبوت دیا بلکہ ۱۸۱۳ء میں ہوئی اودھ کی غلطی کا بھی ازار کیا۔

۶ جولائی کو بیگم حضرت محل نے تمام فوجی اور غیر فوجی حکام کو اکٹھا کیا اور انگریزوں کی چال و سیاسی حالات، اپنے فرائض اور عیار دشمن سے لڑنے کے لیے تیار رہنا اور سامان مہیا کرنے کے لیے آگاہ کیا۔ لڑائی کے سامان و رسد کے لیے اپنا ذاتی اثاثہ نقد، جواہرات وغیرہ سب کچھ دیدیا۔ حکام کو خلعتیں اور خطاب عطا کیے گئے، اودھ اور برہمن اودھ کے مجاہدین سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا۔

حقیقت میں جو جنگ بیگم حضرت محل نے لڑی وہ جنگ آزادی تھی نہ کہ خود غرض سوزش پسندوں کی بغاوت اور فساد انگیزی کے بارے میں لوگوں کا جو خیال

ہے وہ تاریخی حقائق سے دور ہے بیگم صاحبہ نے برجیس قدر کے نام سے جو فرمان جاری کیا اس کو اودھ کے لوگوں نے بہت پسند کیا فرمان ملاحظہ ہو۔

فضلِ خدا سے بتاریخ سعید روزنیک مابدولت و اقبال نے مسندِ آبائی پر جلوہ فرمایا تمہیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج و اہل کار کسی گھاٹ سے تمہارے حلقہ میں اترنے نہ پائے جس طرح ہو مقابلہ کرنا اور بغور دیکھنے کا حکم نامہ لہذا فوج و توپ در وقت پر حاضر ہونا تاکید جانو۔

انگریزی فوج کے مقابلہ میں بیگم کو ایک طرف تو عیار دشمن سے بھر لینا دوسرے کچھ ضمیر فروش ہندوستانی بھی آستین کا سانپ بنے ہوئے تھے۔ چند شاہی بیگمات بھی حضرت محل سے حسد کر رہی تھیں، ان کی سازشوں نے بھی ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہر ایک انگریزوں کی مدد سے اپنے اپنے بیٹوں کو تخت پر بٹھانے کی غرض میں مخالفت پر تلی ہوئی تھیں ایسے نازک دور میں بیگم نے مناسب قیادت کر کے اتحاد قائم کیا اور بتایا کہ: ”ہماری آزادی اور ملک و قوم کا سب سے بڑا دشمن فرنگی نہیں آپسی کھیوٹ اور جھگڑے ہیں، اس وقت بیگم صاحبہ نے فوج کی کمان خود سنبھال کر اپنی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا اور اس وقت لکھنؤ کے قیصر باغ کی جو لکھی محل میں بیگم صاحبہ مقیم تھیں، مجاہدین نے نئے جوش کے ساتھ حملہ کر کے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

”حضرت محل کی سرکردگی میں صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ بٹھا اور انگریز عمل داری خواب معلوم ہوتی تھی۔“

مگر فتح کی خوشی۔ بہت جلد شکست میں بدل گئی حالات بالکل بدل گئے۔ انگریزوں نے لکھنؤ کے عالم باغ پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریز شہر کے حدود میں داخل ہو گئے۔ چند دشمن نے قیصر باغ کا رخ کیا۔ بیگم اور برجیس قدر کی جان خطرہ میں تھی۔ ۱۴ مارچ ۱۸۵۸ء قیصر باغ بھی دشمن کی زد میں آ گیا برجیس قدر اور اپنی جان خطرہ میں دیکھ کر خیر خواہوں اور چوگانی کی بیگمات کے

ساتھ مولوی گنج پھریس پھر سین آباد ہوتی ہوئی موسیٰ باغ پہنچ کر پناہ لی۔ قیصر باغ پر بیگم کے بٹے ہی مکمل انگریزوں کا قبضہ ہو گیا پھر پورا شہر اترنے لگا۔ انگریز جنرل اوڈرم نے بیگم کو پیغام بھیجا کہ : ”جنگ سے دست بردار ہو جاؤ، ہم واجد علی شاہ کا ملک بدستور آپ کے حوالے کر دیں گے۔“ لیکن دشمن کے آگے سر جھکا تا بیگم نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بیگم صاحبہ ایک لاکھ سہرا بیٹوں کے ساتھ لکھنؤ سے بہرائچ کے پاس بوندی کے قلعہ میں پہنچ گئیں مگر قسمت نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا۔ بیگم نے انگریزوں کے خلاف نیپال سے مدد چاہی مگر مدد نہ مل سکی آخر کار بیگم صاحبہ برہمپور کے ساتھ نیپال پہنچ گئیں۔ وطن سے دور نیپال کے ایک گمنام گوشے میں بیگم صاحبہ برہمپور کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں اور نیپال کی راجدھانی کاٹھمنڈو میں بیگم صاحبہ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور یہی مسجد بیگم کی ابدی آرام گاہ ہے۔

بیگم حضرت محل کا انتقال اپریل ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ مگر ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کا بیان ہے کہ بیگم حضرت محل کا انتقال ۱۸۵۷ء کو ہوا۔

نیپال پہنچ کر بیگم صاحبہ نے تمام زمینداروں اور تعلق داروں کے نام احکام جاری کیے کہ ”ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرہنگ لازم ہے، باہم شریک ہو کر باقی ماندگان گارو کو قتل کر دو جو ان کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔“ بیگم حضرت محل کی مشاورتی کمیٹی میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک تھے تمام امور سلطنت کمیٹی کی رائے سے طے ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ نے بھی رانی لکشمی بانی کی طرح عورتوں کی ایک تنظیم بنائی۔ نیپال سے حضرت محل نے یہ اعلان کیا کہ ”ہندوستان کی جنگ آزادی کا یہ اختتام نہیں آغاز ہے۔“ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں نے جنگ آزادی کی جوشم روشن کی تھی ۱۹۴۷ء تک وطن پرستوں کے سینوں میں مشعل بن کر بھڑکتی رہی۔

ارض ہند کی اس غیرت مند خاتون نے بدیسی جبر و استبداد کا دو ڈھائی سال مقابلہ

کیا اور ہتھیار ڈالنے کے بجائے نیپال کی دشوار گزار گھاٹیوں میں گزاری اور جلا وطنی کی زندگی کو ترجیح دی۔

”بیگم حضرت محل نے یہ جنگ تو ہاری مگر بہت نہیں ہاری“ اور بار بار کہتی ہیں کہ ”ہندوستان کی آزادی کا اختتام نہیں آغاز ہے“ بقول چارلس پال کہ ”ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد بھی اودھ کی رعایا میں اپنے محبوب بادشاہ کے لیے ہی جوش و خروش تھا۔ وکٹوریہ کے اعلان کے چھ مہینے بعد بھی شکر پور، ڈھوڑھیا، کھیرہ، رائے بریلی اور سیتاپور وغیرہ میں برابر لڑائی چلتی رہی“۔

لکھنؤ میں تو دلکش باغ، قدم رسول، بیگم کوکھی، سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف قیصر باغ وغیرہ میں تو ہر طرف موت کا بازار گرم رہا، مگر انگریزوں نے اس پر قابو پالیا تھا احمد اللہ شاہ بیگم حضرت محل کے مشیر خاص تھے۔ مصنف رسل کا ارشاد ہے کہ ”بیگم حضرت محل بہت ہی ہوشیار، قابل اور دورانہدیش خاتون تھیں۔ مورخ محمد ار کا بیان ہے کہ ”بیگم حضرت محل اور احمد اللہ شاہ کی موجودگی ہی فوج کے لیے باعث تقویت تھی“ گریٹ اور ٹامس۔ بیگم حضرت محل کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں ان کا بیان ہے کہ بیگم حضرت محل نے اعلان کیا کہ انسان کے لیے چار چیزیں بہت ضروری ہیں:-

(۱) مذہب (۲) عزت (۳) زندگی (۴) دولت

محترمہ ڈاکٹر سمیع الدین نے اپنی معروف تصنیف میں تحریر کیا ہے کہ ”بیگم حضرت محل کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے ہاتھوں آزادی کی شاندار فتح کی اینٹ اول رکھی ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانہ میں اودھ کے باغی سپاہیوں کی قیادت کا بارگراں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انھوں نے جن غیر معمولی جرأت بہادری اور ذہانت کا ثبوت دیا اسے جنگ آزادی کی تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا۔

۱ اور جنگ آزادی ص ۱۰ تاریخ بغاوت ہند از چارلس پال جلد دوم

روشنوں پر جہاں کبھی نازک اندام قدم رکھتے تھے۔ آج کشت و خون ہو رہا تھا وہ برگ گل جن کو ہر صبح شبنم نکھارتی تھی آج لہو سے سرخ رو تھے۔“

اعلان میں میگم حضرت محل نے آگاہ کیا کہ اگر یہ صورت رہی تو پھر جدید اصلاح کی ہوئی کمپنی پہلے راجہ بھرت پور کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس غریب ویکس کا علاقہ ہتھیا لیا۔۔۔ ٹیپو سلطان سے کمپنی کی بد عہدی عالم آشکارا ہے، لاہور کے راجہ دلپ سنگھ کو خداوندان کمپنی جید سے لندن لے گئی پھر انھیں ہندوستان آنے کی اجازت نہ دی۔ نواب شمس الدین خاں کو۔۔۔ انھوں نے تختہ دار پر لٹکایا اور دوسری طرف ان کی عقیدت مندی کے گن گائے پیشوا کو پونا اور ستارہ سے بانر کال دیا اور زندگی بھر بھٹور میں نظر بند رکھا راجہ بنارس کو آگرہ میں قید رکھا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے فرماں رواں کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ فوج کے اخراجات کو پورا کرنے کے جید سے کمپنی نے ہمارے آمدنی کے علاقے کے لیے اور یہ بھی کہا کہ پھر کبھی ہم آپ سے خواستگار نہ ہوں گے۔ اگر یہ انتظامات قائم رہے تو اگلی اور موجودہ حالت میں کیا فرق ہوا۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ہمارا ملک بھیجیں واپس نہیں دیتے۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ ملکہ انگلستان کو اپنا علاقہ بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن پھر بھی دہلی ریاستوں کو اپنی مملکت میں شامل کرنے سے باز نہیں رہیں۔۔۔۔۔ اعلان میں یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن دوسرے مذہب والوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے اور سب لوگ ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے مگر عدل پسند حکومت کو کسی مذہب کے برحق و باطل ہونے سے کچھ نہ دیکھا نہ سود کھانے شراب پینے کو جائز قرار دینے چربی لگے کار تو سوں کو دانتوں سے کاٹنے مٹھائیوں میں سور کی چربی کی آمیزش سڑکوں کی تعمیر کے جید سے مسجدوں اور مندروں کو منہدم کر کے گر جے بنانا اگلی کو چوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے پادریوں کو بھیجنا ان سب باتوں کی موجودگی میں لوگ کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دست اندازی نہ کی جائے گی۔۔۔۔۔۔۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں کا خون بہایا ہے یا قتل میں کسی طرح کی مدد کی ہے ان کو سزا دے قانونی جھگٹنی ہوگی۔۔۔۔۔۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں غنا و دشمنی جھلک رہی ہے ہم اپنی عزیز رعایا کی حالت پر بہت غمگین ہیں۔ لکھنؤ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷-۱۸۵۸

ملکہ و کٹوریہ کے اعلان کا اثر حضرت محل کے اعلان سے اس طرح ختم ہو گیا جیسے آفتاب کی شعاعوں سے شبِ بنم اڑ جاتی ہے۔ مگر حالات بالکل بدل چکے تھے۔ آخر ناکام ہونا پڑا۔

شیخ تصدق حسین نے اپنی معروف تصنیف بیگمات اودھ میں مندرجہ ذیل بیگمات کی فہرست پیش کی ہے جس کو بیگم حضرت محل کی سوانح کے ساتھ تحریر کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان میں بہت سی بیگمات کی رشتہ داری مغلیہ خاندان سے بھی تھی۔ ان بیگمات کے نام اس طرح تحریر ملتے ہیں نواب صدر جہاں بیگم، عالیہ سلطان بیگم، نواب شمس النساء بیگم، افضل بیگم، ٹاٹ محل، سنگی خانم، نواب پادشاہ بیگم، نواب مبارک محل، سلطان مریم بیگم، سرفراز محل، ممتاز محل، ممتاز محل تالی، نواب سلطان بہو صاحبہ نواب ملکہ زمانہ، تاج محل نواب بادشاہ محل، صاحبہ محل، بھول محل، نواب مخدومہ عالیہ، قدسیہ محل، کنگلا محل، نواب آفاق، ملکہ کشور صاحبہ سلطان محل، سلطان محل دوم، نواب حضرت محل، مخدومہ عظمیٰ، نواب عالم آرا بیگم، اختر محل، نواب اشتیاق محل صاحبہ نواب سلیمان محل، نواب امیر محل، پری محل، عاشق محل، نواب انجم النساء بیگم، عرف انجو بیگم، نواب معشوق محل، سکندر محل، سرفراز محل، نواب سلطان، جہاں محل، چیترا محل، ممتاز محل ثالیث۔

حقیقت میں حضرت محل بیگم مایہ ناز اور بہادر خاتون نے قومی تاریخ میں ایسے امنڈ نفوش چھوڑے ہیں کہ تاریخ ان کو مٹا نہیں سکتی اس کے کارنامے ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہوئے بیگم کی وفات قوم کو حیات کا درس دیتی ہے۔

”انھیں چراغوں کے گل سے جلیں گے کتنے چراغ“

۱۹۳۷ء سے مرحوم مجاز نے حضرت محل جیسی خوانین کی زندگی سے متاثر ہو کر ملک کی خوانین کو نصیحت کی ہے کہ :

”ترے ماتھے پر یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن

تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا سکتا

مولانا شریف بیگم حضرت محل کی مستعدی نیک نفسی اور صبر و قناعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

صاحب جی

بھارت کی شیردل خاتون

صاحب جی شاہجہانی عہد کے معروف انجیر اور زبردست جنرل و عالم فاضل علی مردان خاں کی بلند اختر نیک دختر تھی۔ والد کی تعلیم و تربیت نے صاحب جی کو ہمت اور حوصلہ بخشا۔ صاحب جی کی شادی کے بارے میں مائثر الامرا کا بیان ہے کہ اس کی شادی میراں امیر خاں سے ہوئی۔ یہ زمانہ سخت امتحان اور حوصلہ کا تھا میراں امیر خاں اس زمانے میں کابل کا گورنر تھا۔ ایسے نازک دور میں اگر صاحب جی شوہر کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اپنے کام میں ناکام رہتے۔ صاحب جی نے کسی بغاوت اور سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

افغانستان کے اکھڑ مزاج سپاہیوں اور سرکشوں کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے۔ ۱۹۰۹ء میں افغانستان میں نت نئے فتنے اور فساد جنم لے رہے تھے چاروں طرف ہنگاموں کے بھونچال اور سازشوں کی سرنگیں دکھائی دیتی تھیں ایسے خطرناک اور ہولناک دور میں صاحب جی نے بڑی عقلمندی، دانشمندی، تدبیر اور سیاسی بصیرت سے اپنے شوہر کا ساتھ دے کر تاریخ میں مثال قائم کی وہ ہمیشہ اپنی فوج کی ہمت افزائی کرتی رہتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد جب تمام امراء تعزیت کے لیے صاحب جی کے گھر آئے تو صاحب جی نے سب کو مخاطب ہو کر دلیری کے ساتھ اعلان کیا کہ :

”جو وظیفہ تمہیں ملتا ہے یا جو نذرانہ تم کو دیا جاتا ہے وہ بدستور جاری رہے گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ فتنہ انگیزی اور شورش پسندی کا سودا اپنے دماغوں سے نکال ڈالو اور چپ چاپ اپنے علاقوں میں واپس چلے جاؤ اگر تم مجھے ایک کمزور عورت سمجھ کر ملک میں فساد پیدا کرنا چاہتے ہو تو ”ہمیں میدان و ہمیں چوگان“ اگر میں فتحیاب ہو گئی تو

قیامت تک میرا نام مردانگی کی تاریخ میں مہر تاباں کی طرح چکتا رہے گا اور اس حالت میں تمہیں ندامت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور آنے والی نسلیں تمہیں ننگ خلافت بزدل اور بوسے سمجھ کر ہمیشہ نفرت و ملامت سے یاد کیا کریں گی۔

بغرض محال تم کامیاب بھی ہو گئے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی جس کا کام اولاد کی پرورش اور امور خانہ داری کی نگہداشت کے سوا اور کچھ نہیں اور جس پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مردانگی نہیں ہے۔

”اس تقریر سے وحشی افغانوں کی گردنیں شرم کے مارے جھک گئیں انھوں نے سعیت کے لیے ہاتھ بڑھا ئے اور صاحب جی کے ہاتھ پر تجدید اطاعت کی۔“

صاحب جی نے شوہر کی وفات کے بعد افغانستان میں کسی شورش کو برپا نہیں ہونے دیا۔ میراں امیر خاں کی وفات کے بعد عالمگیر نے شاہ عالم بہادر کو کابل کا گورنر بنا کر بھیجا اور یہ نصیحت سخت ہدایت کے ساتھ بذریعہ فرمان کی گئی کہ ہر کام میں صاحب جی سے مشورہ کر لیا کریں۔ اور جس طرح وہ مشورہ دیں اسی پر عمل کریں۔

آخر میں کابل سے صاحب جی برہانپور ہوتی ہوئی سورت پہنچی اور وہیں سے بیت اللہ شریف روانہ ہو گئیں بقیہ زندگی مکہ مکرمہ میں بسر کی۔ صاحب جی بہت ہی سخی دل اور فیاض طبیعت خاتون تھیں۔ وہاں بھی ہر ہندوستانی کے لیے اس کا دسترخوان کوٹنا نہ نہیں ہوا۔ مائثر الامراء نے لکھا ہے کہ ایک دن صاحب جی ڈولی میں بیٹھ کر ایک کوچہ سے گزری تو ایک شاہی مست ہاتھی نے اس کی ڈولی کو سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر دے ماری جب ہاتھی نے ڈولی کو پاؤں کے تلے روندنے کی پہل کی تو شیر دل خاتون عفت بجلی کی طرح سرعت سے تڑپ کر ایک صراف کی دکان میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس طرح بھارت کی اس شیر دل خاتون نے ہاتھی سے اپنی جان کی حفاظت کی۔

جہانوی بیگم

اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کا نام ممتاز ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو مقام تاریخ تیموریہ میں نور جہاں کو حاصل ہے وہی مقام شاہان اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کو حاصل ہے وہ ایک اعلیٰ دماغ کی حامل تھی۔ ملکی سیاست پر مکمل طور پر حاوی رہی اس کا رعب و دبدبہ اچھے اچھے سہرکشوں کے سینوں کو ہلا دیتا تھا۔ وہ بہت ہی شان و شوکت کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ تادم حیات حکومت کرتی رہی۔ بہو بیگم کا اصلی نام آمنہ الزہرا تھا وہ نواب موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں کی دختر تھی۔ اس کی شادی شجاع الدولہ صفدر جنگ کے بڑے بیٹے سے ہوئی۔ محمد شاہ کی شاہی گود میں اس نے تعلیم و تربیت پائی۔ اس کی شادی سے پہلے ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی نجم الدولہ نے اسے بیٹی کی طرح پالا اور بڑے دھوم سے بہو بیگم کی شادی کی محمد شاہ نے بھی اسے جہیز دیا۔ تاریخ فرح بخش سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ نے اسے ایک ہزار چاندی کے پیالے عطا کیے اور ایک پیالے کا وزن سو چاندی کے روپیہ کے برابر تھا۔ ایک نولا کھ سالانہ آمدنی کی جاگیر بھی عطا کی شادی میں دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا فیض آباد میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا، شجاع الدولہ اس کا بے حد احترام کرتا تھا اور اسے مہرداری کا کام بھی سپرد کر دیا تھا اور ضلع گونڈہ کی قیمتی جاگیر بھی عطا کی اس کے سگے بھائیوں کو اعلیٰ عہدے بھی حاصل ہوئے۔ بیگم بھی اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی تھی ۱۷۶۴ء جب شجاع الدولہ کو بکسر کی لڑائی میں شکست ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اس کی ہر طرح سے مالی امداد کی۔ اس نے کہا کہ اگر نواب زندہ و سلامت ہے تو سب کچھ ہے ورنہ یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انگریزوں نے بھی بیگم صاحبہ کی فراخ دلی اور شوہر پرستی کی تعریف کی ہے ۱۷۷۱ء میں جب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا آصف الدولہ تخت نشین ہوا تو اب بیگم کی کتاب حیات کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ آصف الدولہ عیش پرست اور عیاش

طبعت نکلا ریاست کی رقم کو ختم کر دیا۔ آصف الدولہ کا کچھ دن کے بعد ہی انتقال ہو گیا۔ پھر بیگم کا سوتیلا بیٹا سعادت علی تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے بھی بیگم کے خزانے کو لوٹنے کی کھان لی ۱۸۱۶ء میں کچھ دن بیمار رہنے کے بعد بیگم کا انتقال ہو گیا۔ بیگم نے ۸۶ سال کی عمر پائی۔ مقبرہ جو اسہر باغ میں ہے جو فیض آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے نہایت دین دار نیک خصلت تھی۔ دل کھول کر خیرات کرتی تھی۔ مسٹر آر۔ ایچ آر نیو اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ بیگم کے زمانہ میں روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ محمد خلیل اسی کے دربار کا خوشنویس تھا جو تحریر کی اٹھارہ طرزیں جانتا تھا اور قدیم مکتوب کی اسی طرح کی نقل کر دیتا تھا۔ اصل اور نقل میں فرق نہیں رہتا۔ مرزا طاہر مہرکن بھی اسی کا درباری تھا۔ وہ غریب پرور یتیم مسکین لڑکیوں کی مددگار ہزاروں بکیں عورتیں پرورش پاتی تھیں، ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت سے مدرسے جاری کیے۔ اس کی زندگی عورتوں کے لیے نازیانہ عبرت ہے۔ استطاعت اور طاقت رکھنے کے باوجود اس نے فرائض منصبی کو فراموش نہیں کیا۔

لُطْفُ النِّسَاءِ

لطف النساء نواب سراج الدولہ کی غیور بیگم تھیں۔ لطف النساء کا اصلی نام راج کنور تھا۔ راج کنور کا نام بنگال کی معروف خواتین میں مہر منور کی طرح روشن ہے بیگم کی زندگی کا زیادہ تر حصہ غم و آلام میں گزرا مگر اپنے صبر و استقلال سے لطف النساء نے ثابت کر دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت عورت کے دل پر نہ قبضہ کر سکتی ہے نہ سخت سے سخت امتحان اس کو متزلزل کر سکتا ہے۔

راج کنور ایک ہندو گھرانے کی چشم چراغ تھیں وہ چھوٹی عمر میں نواب سراج الدولہ کے یہاں جاریہ ملازم ہوئی۔ راج کنور سے پہلے سراج الدولہ کی شادی عمدہ النساء عرف بہو بیگم سے ہو چکی تھی اس کے بعد سراج الدولہ کی شادی راج کنور سے ہوئی اپنے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی بنا پر راج کنور نے نواب صاحب کے دل پر اپنا اثر جما لیا۔

نواب سراج الدولہ کے والد شجاع الدولہ کو کسی افغان نے ۱۷۴۷ء کو قتل کر دیا اس کے بعد سراج الدولہ کے دادا نواب علی وردی خاں نے ————— کسی وجہ سے بہار کا گورنر راجہ جانی رام کو بنا دیا اس پر پوتے اور دادا میں اختلاف پیدا ہو گئے مگر لطف النساء نے اپنی دانشمندی سے دونوں کے اختلاف کو ختم کر دیا۔

کچھ عرصے کے بعد بہو بیگم کے والد محمد ایرج اور میر جعفر سراج الدولہ کے جانی دشمن ہو گئے پلاسی کی جنگ اسی دشمنی کا نتیجہ تھی جس میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی، سراج الدولہ لطف النساء کے ساتھ بھگوان گور پہنچا اور وہاں سے عظیم آباد کو روانہ ہوا۔ راستہ میں بہرام کے مقام پر دانا ستاہ کے مزار پر کچھ کھانے کی چیز کی تلاش میں پہنچا۔ وہاں میر جعفر کے داماد میر قاسم کو جیسے ہی سراج الدولہ کی خبر ملی فوراً ہی دونوں کو گرفتار کر لیا اور سارا سامان چھین لیا۔ سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا اور لطف النساء کو مرشد آباد میں رہنے کی اجازت دیدی گئی۔

لطف النساء نیک بخت اور پاکباز عورت تھیں شومہ کی وفاداری کی مثال تاریخ میں دیکھنے

کو کم ملتی ہے شوہر کی وفات کے بعد بہت سے امراء نے لطف النساء سے شادی کے لیے پیغامات بھیجے مگر غیور عورت نے جواب دیا کہ جو ایک بار ہاتھی کی سواری کر چکا ہو وہ گدھے پر سوار نہیں ہو سکتا۔

وہ ہمیشہ بھاگرتی ندی کے دائیں کنارے موتی تھیل کے سامنے خوش باغ میں زندگی کے آخری لمحہ تک رہیں نواب سراج الدولہ بھی وہیں مدفون ہیں۔ لطف النساء کی خوش نصیبی کہ شوہر کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی اس نے قاری اور مولویوں کو قرآن خوانی کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ وہ نواب صاحب کے مزار پر قرآن پاک پڑھتے رہیں۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں لطف النساء کی وفات ہوئی۔ سراج الدولہ کے بعد ۲ سال تک حیات رہیں ایسے دردناک دافلاس و مصیبت کے دور میں بھی اس غیور بیگم کے صبر و استقلال نے اہل عالم کو دکھایا کہ ایک مسلمہ کا اخلاق اور چلن ایسا ہونا چاہیے۔

رضیہ سلطان



رضیہ سلطان

رضیہ سلطان

رضیہ سلطان، سلطان شمس الدین التمش کی بلند اختر اور قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔ التمش ایک تاتار رئیس کا جگر بھٹا مگر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں بھائیوں نے اسے بخارا کے شہزادہ کے ہاتھوں بیچ دیا۔ رضیہ سلطان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت سے سیاسی بصیرت اور قابلیت اور عسکری صلاحیت پیدا ہو گئی۔ رضیہ سلطان کی پیدائش کو شک فیروزی میں ہوئی وہ التمش کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی تھی وہ بہت ہی ذہین اور موہنہار لڑکی تھی، وہ پہلی مسلمان خاتون تھی جو دہلی کے تخت پر رونق افروز ہوئی۔ التمش رضیہ سلطان کے اوصاف دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ ۶۳۳ھ میں اس کو اپنا جانشین مقرر کیا اور رکن الدین (بھائی) کے بعد ۶۳۴ھ میں تخت پر بیٹھی۔ مسلمانوں کے اعتراض پر التمش نے جواب دیا کہ :

”میرے لڑکے جوانی کی عیاشی میں غرق ہیں اور ان میں سے کوئی بھی سلطان ہونے کے لائق نہیں وہ ملک کی حکمرانی کے قابل نہیں ہیں اور میری وفات کے بعد آپ دیکھیں گے کہ حکومت کو چلانے میں میری لڑکی سے زیادہ اور کوئی قابل نہیں ہوگا۔“

رضیہ سلطان نے التمش کی زندگی میں ہی حکمرانی کا پورا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ دور و دراز علاقوں میں بھی جنگ کے وقت باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جب رضیہ خود حاکم بنی تو اس نے بڑی بہادری سے ملتان، لاہور، اور ہانسی وغیرہ کے باغیوں کو دبا دیا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن وزیر اعظم محمد جنیدی بھی جان بچا کر بھاگ گیا اس نے عورت کا لباس اتار دیا اور مردوں کے لباس میں ملبوس رہنے لگی، لڑنے کے لیے میدان جنگ میں خود جایا کرتی تھی۔ منہاج الدین سراج جو اس کا ہم عصرونہ تھا اپنی معروف تصنیف طبقات نادرہ

میں رضیہ سلطان کے اوصاف کو یوں تحریر کرتے ہیں کہ :

” وہ ایک عظیم ملکہ، انصاف پسند، بہبودی رعایا کی خواہاں، یکساں
پسند محافظ رعایا اور اپنی افواج کی کمانڈر تھی۔“

منہاج آگے تحریر کرتے ہیں کہ

” سلطان رضیہ کو خدا نے وہ سب خوبیاں عطا کی تھیں جو شاہانِ عادل
اور کامل میں ہوتی ہیں وہ عاقل، عابد، کریم عالم نواز، عدل گستر، رعایا
پرور اور بہادر تھی اس میں سوائے عورت ہونے کے اور کوئی نقص نہ تھا
اس لیے اس کی صفات گریہ نے نفع نہیں پہنچایا۔“

ابو قاسم فرشتہ ملکہ کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے کہ :

” سلطان رضیہ میں صفاتِ جہانداری موجود تھیں عقل فہم حسن تدبیر

وسیاست میں عورت اپنے زمانے کے بہترین مردوں کے ہم پلہ تھیں۔۔۔۔۔

مذہبی معلومات اور دوسرے علوم و فنون میں بھی اسے اچھی دستگاہ حاصل تھی۔“

رضیہ سلطان نے منہاج الدین سراج کو ناصریہ کالج دہلی کا پرنسپل مقرر کیا۔ رضیہ سلطان نے بہت
مکاتب اور مدارس جاری کیے وہ علماء کی قدردان اور قرآن پاک کی دلدادہ تھی ہر کام تلاوت
قرآن پاک سے کیا کرتی تھی۔

جس وقت رضیہ سلطان تخت پر بیٹھی تمام حکومت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی مگر اپنی قابلیت
اور صلہ مندی سے رضیہ نے تمام باغیوں پر قابو پایا۔ اور ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ اور باغیوں کو
آپس میں لڑوا کر ان کی قوت کو پوری طرح ختم کر دیا اور رنخبور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ جنیدی باغیوں
کی مدد کر رہا تھا، اس کو مکمل طور سے تباہ کر دیا۔ ان دنوں نور ترک جو اسماعیلی عقیدے سے تھا
اور قرامطہ اور ملحدہ فرقہ کا حامی اور حنفی اور شافعی مسلمانوں کا دشمن تھا رضیہ کے زمانے
میں پوری طرح ختم ہو گیا اور ملک فتنہ فساد سے پاک ہوا رضیہ نے ہر شورش اور بغاوت کو
ختم کر کے ملک میں چاروں طرف امن و امان قائم کیا۔ اس کی دانشمندی اور رعیت نوازی سے

ملک میں خوشحالی نظر آنے لگی اور تجارت نے فروغ پایا۔ اس نے ”ترکان چہل گان“ (چالیس امیروں کا گروہ) کو ختم کرانے کی کوشش کی۔ اس گروہ کا کام یہ تھا کہ جس کو وہ چاہتے سلطان بنا دیتے اور جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے تھے۔ یہی گروہ ملک کی سیاست پر اقتدار جمائے ہوئے تھا، چاروں طرف انھوں نے ہی بغاوتیں برپا کر رکھی تھیں۔ عورت ہونے کی وجہ سے امراد رضیہ سے مخالفت پر تلے ہوئے تھے اس خامی نے ہی رضیہ کے تمام اوصاف کو اس طرح نقاب پوش کر دیا جس طرح ساون کے مہینہ میں سیاہ بادل سورج کی کرنوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ بالفاظ ایک مورخ ”ماسوائے عورت ہونے کے اس میں تمام شانہ اوصاف تھے اور اس کمی کی وجہ سے مردوں کی آنکھوں میں اس کے تمام اوصاف مفقود ہو گئے“ ایک عورت کے تخت پر رہنا اپنی بے غیرتی سمجھتے تھے۔ وہ رسول اکرمؐ کی حدیث سے بھی واقف تھے۔ عورت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

”دنیا میں سب سے بیش قیمت چیز ایک پاک عورت ہے لیکن جو لوگ

عورت کو حاکم بنائیں گے انھیں کبھی دل کا سکون نصیب نہیں ہو سکتا“

جلد ہی سردار بے چین ہو اٹھے اور انھوں نے یاقوت نامی ایک حبشی غلام کو داروغہ اسطبل سے فوجی افسر بنانے پر بغاوت کھڑی کر دی، رضیہ یاقوت پر بہت مہربان تھی۔ امیروں نے اس کے بے پردہ ہو کر دربار میں آنے پر بھی اعتراض کیا۔ اس بنا پر لاہور اور جھٹنڈہ کے صوبیداروں نے بھی بغاوت کر دی۔

رضیہ سلطان اختیار الدین التونیہ (والئے جھٹنڈہ) کی بغاوت کو دبانے کے لیے جھٹنڈہ پہنچی تو رضیہ سلطان کو وہاں قید کر لیا لیکن رضیہ سلطان نے وہاں دورانیشی اور دانشوری سے کام لیا اور اختیار الدین سے شادی کر لی۔ باغیوں نے پہلے ہی رضیہ سلطان کے بھائی بہرام شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا تھا حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے رضیہ بیگم التونیہ کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھی۔ لیکن اس کی فوج کو بڑی طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جب رضیہ نے اپنے خاوند کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا چاہا تو باغیوں نے ان کو پکڑ لیا اور ۱۲۳۱ء میں دہلی کو ترہیع کر دیا۔ اس طرح رضیہ سلطان نے تین سال چھ دن حکومت کی۔

”مسلمانوں کے عہد کی پہلی ملکہ رضیہ سلطان بادشاہ بنی۔ یہ شہزادی غنچہ دہن گلبدن،
 ماہ طلعت خورشید تھی۔ حسن ظاہری کے علاوہ نہایت ذہین اور فہم رس تھی، شہزادی کے
 گھوڑے کی سواری دیکھ کر شہسوار حیران رہ جاتے تھے۔ قطب مینار پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ ایسی
 عالی دماغ عورت کی قابلیت کا نمونہ ہے۔“



پدمنی

رانی پدمنی

پدمنی میواڑ کے راجہ رتن سنگھ کی رانی تھی۔ (چتوڑ)۔ جو راجپوتانہ میں واقع ہے یہاں کے لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں۔ راجہ رتن سنگھ تیرہویں صدی کے آخر میں میواڑ کا حکمراں تھا پدمنی — راجہ امر سنگھ چوہان کی چہتی بیٹی تھی۔ ”ہندوستان کی بہادر عورتیں کتاب کے مصنف کا بیان ہے کہ پدمنی ایک کھلے ہوئے کنول کے مانند خوبصورت تھی اس کا نام خود ہی اس کے جس کی دلیل ہے“ اس زمانے کے کوہلو اور شاعروں کا خیال ہے کہ رانی پدمنی کے حسن و جمال کی تعریف کرنا محال ہے۔ آنکھیں ستاروں کو ماند کر دیتی ہیں بدن گلاب سے زیادہ نازک دانت موتیوں سے زیادہ شفاف اور آبدار تھے، اس کے ہونٹ یا قوت کومات کرتے تھے اس کی سبک خرامی لوگوں کے دلوں کو پامال کر دیتی تھی۔ رانی پدمنی میں رحم دلی اور خدا ترسی بھی بے حد تھی۔

رانی پدمنی کے حسن و جمال کی داستان سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جب تک چاند سورج باقی ہیں پدمنی کا نام آسمانِ مردانگی پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکتا رہے گا اس رمز شناس خاتون کے حسن و جمال نے سب حسیناؤں کی شمع حسن کو بے نور کر دیا تھا۔

”حقیقت میں رانی پدمنی چتوڑ کا مہتاب چودھویں رات کا چاند کو دن مہنم روز تھی۔“ جب سلطان علاؤ الدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ کے دوران رانی قلعہ کی فسیل پر جنگ کا نقشہ دیکھ رہی تھی۔ اس جنگ میں جب راجہ رتن سنگھ مارا گیا تو علاؤ الدین خلجی نے قلعہ پر قبضہ کے بعد رانی پدمنی کو حاصل کرنا چاہا۔ پدمنی سلطان کے لوگوں کی نیت کو لے ڈاکٹر جی ایچ اوجھا، ڈاکٹر کے۔ ایس لال اور خواجہ امیر خسرو نے سلطان علاؤ الدین اور پدمنی کے واقعہ کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ دیگر مورخ بھی اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس کو صرف ملک محمد چانسی نے ہی پیدماوت میں ہی تحریر کیا ہے جو خیالی ہے۔

سمجھ گئی تو رانی نے اپنی عورتوں سے کہا کہ اب جینا حرام ہے بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے آؤ ہم بھی چنوڑ کی تاریخ میں اپنا نام کر جائیں؟“

رانی کی اس تقریر کا وہاں کی عورتوں پر بہت اثر ہوا، رانی نے پھر کہا ”تم میں سے جس کو عزت سے جان پیاری ہو وہ میرے ساتھ نہ آئے پیچھے نہ آئے پیچھے ہی کھٹہر جائے۔ سب عورتوں نے رانی کا ساتھ دیا دیکھتے ہی دیکھتے کھول سے نازک جسم شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح راجپوت عورتوں نے سستی بھونے کی رسم کو ادا کیا۔ جب سلطان قلعہ کے اندر داخل ہوا تو اس نے وہاں آگ کے شعلوں اور راگھ کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں پایا سلطان کو منظر دیکھ بڑی حیرت ہوئی۔ آج بھی ہندوستان کی غیرت مند اور بہادر خواتین کی تاریخ میں پدمنی کا نام سنہرے لفظوں میں لکھا ملتا ہے

۱۔ سستی: مخصوص حالات کے پیش نظر ایک ہندو بیوی کو اس کے شوہر کی موت کے بعد جلانا رسم سستی کہلاتی ہے (شاہ ص ۱۳۰) وہ عورت جو خود کو آگ کے سپرد کرتی تھی سستی کہلاتی تھی۔ سستی ہونے کا یہ ناگوار فرض دو طرفہ نہ تھا صرف عورت ہی کو سستی ہونا پڑتا تھا۔ یہ رواج صرف اعلیٰ طبقہ تک محدود تھا۔ ادنیٰ طبقہ میں عورتیں صرف اپنے شوہر کی ارتھ کی کے ساتھ مکان کی دلیز تک ہی رہتی تھیں۔ جدید زمانہ میں اس خیال کی تائید کے لیے دیکھیے سستی از کمارا سوامی ص ۸ مصنف کا خیال ہے، ”انسانی روح مرد اور عورت سے دو قسم کی عقیدت کا تقاضا کرتی ہے عورت مرد سے عقیدت رکھے اور مرد اپنے خیالات سے“

تھامپسن اپنی تصنیف کے ص ۱۹ پر تحریر کرتے ہیں: کہ ”سکندر کے سپاہیوں نے سستی کی رسم کو پنجاب میں پایا“

عورت کو شوہر کے مردہ جسم کے ہمراہ اور اس کے بغیر دونوں طرح سستی کرنے کا رواج تھا اگر مرد

سلطان نے رانی کے محل کو بالکل محفوظ چھوڑ دیا جو آج تک جھیل کے کنارے
اس جاں باز رانی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔

رانی تارا بانی :-

رانی تارا بانی جیسی بہادر خاتون کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ تارا بانی راجہ
رام جو مرہٹہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تارا بانی اسی کی رانی تھی۔

شوہر کی لاش مہیا ہو جاتی تھی تو بیوی کو اس کے ہمراہ جلا دیا جاتا تھا۔ اسے سیہ مرن یعنی ساتھ
مرنا کہا جاتا تھا اور اگر شوہر بیوی سے دور مرتا یا اگر بیوی حاملہ ہوتی تو بعد میں بیوہ کو ایسی چیز کے
ساتھ جلا یا جاتا جس کا تعلق اس کے شوہر سے تھا یا اس کے شوہر کی نشانی ہوتی تھی اس جلنے
کو انومرن یعنی قاعدہ کے مطابق مرنا کہا جاتا تھا۔ ————— متعدد بیویوں میں یہ حق
صرف چھیتی بیوی کو ہی تھا کہ جب اسے جلا یا جانے تو اس کی گردن اس کے شوہر کے بازو پر رکھی
ہو، اگر کسی کی ایک بیوی سے زائد ہوتی تھیں تو شوہر کے ساتھ بڑی بیوی کو سستی ہونا پڑتا تھا اور
دوسری بیویوں کو الگ الگ جلا یا جاتا تھا۔ اس وقت بیویاں اپنے آپسی اختلافات کو اور
عداوت کو بھلا دیتی تھیں جیسا کہ چٹوڑ کے راجہ رتن سین کی بیویوں نے کیا تھا۔ دونوں ہی بیویاں
اپنے شوہر کی لاش کے دونوں طرف انتہائی دوستانہ طریقہ سے بیٹھ گئیں اور خاموشی سے شعلوں
کی نذر کر دیا۔

محترم ڈاکٹر کے ایم اشرف معروف تصنیف ”ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ کے ص ۲۵۲
پر لکھتے ہیں کہ کسی بیوی کا شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے ۔ ۔ ۔ ۔ کا بیان بہت تکلیف دہ
ہے اسے صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم چند مثالیں ابن بطوطہ سے تحریر کرتے ہیں الرحلہ

”راجہ رام مغلوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اپنے شوہر کے قتل کے بعد رانی تارا بائی نے مغلوں کا بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنی سلطنت کی مرتے دم تک حفاظت کرتی رہی وہ ملکی نظام میں پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتی تھی وہ سپہ گری اور فنون جنگ سے بخوبی واقف تھی۔

کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ تارا بائی نے صرف اپنے بیٹے کے لیے کام کیا اس نے نہ کوئی کام ملک کے لیے کیا نہ قوم کے لیے اس لیے اس کا شمار ہندوستان کی بہادر خواتین میں نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جس دور بینی اور دور اندیشی اور دانشمندی سے تارا بائی نے کام کیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے تاریخ کا فیصلہ یہ ہی ہے کہ تارا بائی کا نام ملک کی نامور بہادر خواتین میں ضرور ہونا چاہیے۔ اس لیے تارا بائی کا نام دختران ہند کی جاں باز خواتین کے نام الگ رکھنا زیادتی ہوگی۔

میں بطوطہ نے دونوں قسم کے واقعات کی تفصیل دی ہے۔ شوہر جب دور دراز جنگ میں شہید ہوتا تو یہ خبر سن کر بیوی غسل کرتی، بہترین کپڑے اور زیورات سے زیب تن ہوتی جلد ہی ایک جلوس میں شمشان گھاٹ کی طرف لے جایا جاتا برہمن ہمراہ چلتے ہوئے مستقبل کی زندگی پر اسے مبارکباد دیتے عورت دائیں ہاتھ میں ایک کھوپڑا اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ لے کر گھوڑے پر سوار ہوجاتی جلوس سایہ دار درختوں کے جھنڈ کی طرف گانے اور باجے۔۔۔۔۔ کے ساتھ روانہ ہوتا اور اس جھنڈ میں پانی کا تالاب اور پتھر کی ایک مورتی غالباً یہ مورتی شوہر کی ہوتی تھی تالاب کے قریب آگ چلتی اسپر متاواتر تل کاتیل ڈالا جاتا یہ آگ عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی پورا ماحول دوزخ کا منظر پیش کرتا تھا۔ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ سایہ دار جھنڈ میں پہنچ کر عورت تالاب کے پانی میں نہاتی اور تب اپنے عمدہ کپڑوں اور زیورات کو

تارا بانی مرہٹہ سردار ہمیراؤ (سورسین) کی لاڈلی بیٹی تھی اور سیواجی کے دوسرے بیٹے راجہ رام کی بیوی تھی، تارا بانی نے بھی اپنے بیٹے کا نام دادا کے نام پر ہی شیواجی رکھا، یہ دور مرہٹوں اور مغلوں کی جنگ کا خوفناک دور تھا، مرہٹوں کی مغلوں کے سامنے برابر شکست ہو رہی تھی۔ راجہ رام ایک بار شکست کھا کر دکن کی طرف بھاگ گیا وہاں سے وہ چنچی مقام پر پہنچا اور وہیں تارا بانی کو بھی بلا لیا۔ مغلوں نے اس مقام کو بھی گھیر لیا پھر راجہ رام مہاراشٹر پہنچا اور وہیں شہر میں وفات پائی۔ امبکا بانی جو راجہ رام کی پہلی بیوی تھی، راجہ رام کے ساتھ ہی سستی ہو گئی، اب تارا بانی کو مصیبتوں نے گھیر لیا۔ مگر زندگی کے آخری لمحوں تک تارا بانی نے ہمت نہیں ہاری اور مغلوں کی فوج نے طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا وہ پہاڑوں

ایک ایک کر کے سپردِ آتش کرتی۔ آخر میں وہ کسی سے ایک بغیر سیلا کپڑا مانگ کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتی اور بہت ثابت قدمی اور جرات کے ساتھ آگ کی طرف قدم بڑھاتی جو ابھی تک اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی تھی وہ ہاتھ جوڑ کر اگنی دیوی سے دعا کرتی تھوڑی دیر خاموشی سے عبادت کرتی اور تب اچانک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ خود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی، ٹھیک اسی وقت دوسری طرف سے ڈھول تاشوں کا شور بلند ہوتا جس کا مقصد واضح طور پر خوفناک منظر سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہوتا تھا، دوسرے افراد جو سستی کی حرکات کو بغور قریب سے دیکھتے رہتے تھے۔ جلتی ہوئی صورت کے جسم پر لکڑی کے وزنی ٹکڑے ڈال دیتے تاکہ وہ اس سے نکل سکے یا نکلنے کی جدوجہد نہ کر سکے۔ ابن بطوطہ اس منظر کی تاب نہ لا کر غش کھا گیا، اسے لوگوں نے وہاں سے ہٹایا اس لیے اس کا بیان مزید تفصیلات مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ سستی کی رسم میں جو واقعات ہوتے تھے۔ یہ اس کا کم و بیش صحیح اور مکمل نقشہ ہے

(ابن بطوطہ ج دوم، الفصل ۳ - ۴)

خاتون تھی۔ نشانہ بازی کا یہ عالم تھا کہ تلوار مار کر لیمو کے برابر دو ٹکڑے کر دیتی تھی یہ فولاد جگر عورت گھڑ سواری کی شائق تھی مورخین کا بیان یہ ہے کہ تارا بانی شوہر کے ساتھ ہی بڑے استقلال کے ساتھ اس کا سر گود میں لے کر چٹا میں بیٹھ گئی اور دونوں جل کر خاک ہو گئے مگر بیان زیادہ معتبر معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ شوہر کے ساتھ بڑی بیوی ہی سستی ہوتی تھی۔

اپنے آپ کو شعلوں کی نذر کر دیتی تھی یہ عورت کی اعلیٰ ترین قابل تعریف صفت تھی معاشی دباؤ اور عورت کی پسماندہ حالت بھی سستی کے رواج کے اسباب ہیں: ابوالفضل نے اپنی معروف تصنیف آئین اکبری میں سستی کی اقسام کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

- ۱۔ اس میں عورت کے رشتہ دار اس کو چٹا میں جانے کے لیے مجبور کرتے تھے۔
 - ۲۔ اس میں عورت خود اپنی مرضی سے شوہر کے ساتھ انتہائی محبت کے ساتھ اپنے کو فنا کر لیتی تھی۔
 - ۳۔ تیسری قسم میں عورتیں رائے عامہ کے ساتھ اپنے کو شعلوں کے سپرد کر دیتی تھیں۔
 - ۴۔ چوتھی قسم میں وہ عورتیں تھیں جو خاندانی رسم کے مطابق سستی ہو جاتی تھیں۔
 - ۵۔ پانچویں قسم ان عورتوں کی تھی جنہیں ان کی مرضی کے خلاف آگ میں ڈالا جاتا تھا۔
- خواجہ امیر خسرو کی قرآن السعدین، تاریخ مشنانی نکولو کونی ٹوڈ وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ان کتابوں میں سستی اور جوہر کے سچے واقعات تحریر ہیں۔
- جوہر :-** جوہر کی رسم کم و بیش راجپوتوں تک ہی محدود تھی جب کسی راجپوت سردار کو اور اس کے ساتھیوں میں کسی کو جنگ میں فتح کی امید ختم ہو جاتی تو وہ عام طور پر یا تو اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیتے یا انھیں کسی زمین دوز عمارت میں بند کر کے اس میں آگ لگا دیتے تھے۔ راجپوت میدان جنگ میں مغلوب ہونا یا شکست پر رضا مند ہونا نہیں جانتے تھے۔ وہ یا تو جنگ میں فتح پاتے یا فنا ہو جاتے تھے۔
- خواجہ امیر خسرو نے خزان الفتوح میں رنجھبور کی جنگ میں چوہان ہمیر دیو اور

رانی روپ متی

رانی روپ متی اپنے عہد کی حسن کی دیوی کے نام سے پکاری جاتی تھی اور اس کے حسن کی تعریف تمام بھارت میں پھیل گئی تھی رانی روپ متی کا تعلق اعلیٰ بہادر گھرانہ سے تھا۔ روپ متی کے حسن و جمال میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو پدمنی میں پائی جاتی تھیں۔ پدمنی حسن و جمال کی پری کہلاتی تھی۔ رانی روپ متی بھی حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر تھی جس کی تعریف ہر کوئی اور شاعر نے کی ہے اور روپ متی کے بارے میں بڑے بڑے راگ گائے ہیں اور گاتے رہیں گے۔ روپ متی مالوہ کے راجہ کی رانی تھی رانی روپ متی نے احمد آباد میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

رانی پاربتی

راجہ جھابرسنگھ دیو جو راجہ نرسنگھہ بندیلہ کا بیٹا تھا اس کی شادی رانی

غلاؤالدین خلجی کے واقع کو بیان کیا ہے جس میں علاؤالدین خلجی کو فتح حاصل ہوئی اور راجہ ہمیر نے جوہر کیا ابن بطوطہ نے کمپلا کے راجہ اور محمد بن تغلق کا بھی اسی طرح کا واقعہ تحریر کیا ہے۔ بابر نے اپنی ترک میں راجہ مدنی رائے کی جوہر کی تفصیل بیان کی ہے کہ اپنی شکست کے بعد راجہ مدنی رائے اور اس کے سپاہیوں نے اپنے تمام بچوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ وہ خود آخری دم تک لڑتے رہے اور آخر کار سب کے سب قربان ہو گئے۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ جنگی قیدیوں اور زخمیوں کے ساتھ برتاؤ فاتح کی مرضی پر تھا اور اس کا کوئی معاہدہ یا دستور نہ تھا۔

رسم جوہر کی زیادہ تر مثالیں شمالی ہند میں پائی گئی ہیں۔ دکن میں اس رسم کو فروغ نہ مل سکا۔

پاربتی سے ہوئی تھی۔ راجہ جھابری کی اس محبوب بیوی کے حسن و جمال کی تعریف میں کتابیں بھری پڑی ہیں، راجہ نرسنگھ شہنشاہ جہانگیر کا درباری اور باوقار اور جانثار وفادار آدمی تھا۔

رانی درگاوتی

گونڈوانہ ریاست جو پہاڑی علاقہ میں واقع ہے اور جس کی راجدھانی گرھ کھٹی، وہاں کا راجہ دلپت سنگھ تھا۔ راجہ دلپت سنگھ بہت ہی بہادر اور راجپوتوں کا سردار بھی تھا۔ درگاوتی اسی کی رانی تھی، رانی درگاوتی بھی معروف بہادر راجپوت راجہ کی بیٹی تھی۔ درگاوتی کے شوہر کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ راجہ دلپت سنگھ کی وفات کے وقت درگاوتی کی گود میں شیرخوار بچہ تھا اسی لیے درگاوتی رسم جوہر سے بچی رہی۔ راجہ دلپت سنگھ کی موت کے بعد اب — شیرخوار بچہ کی پرورش اور ملکی نظام کی ساری ذمہ داری درگاوتی پر آگئی۔ رانی کو سب سالار بھی بنایا گیا۔

گونڈوانہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے مغلوں نے آصف خاں کی سالاری میں درگاوتی پر حملہ کے لیے ایک فوج روانہ کی گونڈوانہ پہنچ کر آصف خاں نے حملہ سے پہلے درگاوتی کے پاس مغلوں کی اطاعت قبول کرنے کے لیے پیغام بھیجا، جس میں پیامبر نے کہا کہ ”غیرت دار شریف رانی میں آصف خاں کی طرف سے آ یا ہوں جو اکبر اعظم کا سب سالار ہے یہ پیام گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مغل نہ تو آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے ہیں، اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو شہنشاہ کے سپرد کر دیجیے اور مغل بادشاہ کو اپنا مہاراج تسلیم کر لیجیے پھر ساری فوج واپس چلی جائے گی اور آپ کا راج پاٹ برقرار رہے گا۔

یہ پیغام سن کر رانی غصہ میں آگئی اور اس شرط کو نامنظور کرتے ہوئے

بولی کہ ”فیصلہ اب میدان میں ہوگا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی رانی اور اس کے سپاہی بہت بہادری سے لڑے اور کامیابی حاصل کی اس جنگ کے بعد دوسری بار پھر دونوں فوجوں کا میدان میں آمناسا منا ہوا مگر دوسری بار بھی رانی درگاوتی نے جنگ جیت لی۔ اب آصف خاں کو بہت شرمندگی ہونے لگی، مارے غیرت کے انتقام کی ہزار تدبیریں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کیوں کہ درگاوتی نے مغل فوج کے سورماؤں کے دل دہلا دیئے، تمام دن کشت خوں کی لڑائی میں یہ بہادر رانی اپنے حوصلہ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی کیوں کہ وہ فنون جنگ میں مہارت رکھتی تھی۔ دوسری جنگ کے بعد بد نصیب رانی نے جوش و خروش میں آکر اس بار اپنے سکے بیٹے ”دیرنارائن“ کو فوج کا افسر بنا دیا۔ اس بات سے راجپوت افسروں میں حسد کی بنا پر آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور حاسد فوجی اب دشمن کی فوج سے خفیہ ساز باز رکھنے لگے اور خفیہ خطوط بھی لکھے جانے لگے اب درگاوتی تنہا رہ گئی حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔ آصف خاں موقع کی تلاش میں بیٹھا تھا۔ تبسرا حملہ درگاوتی پر کر دیا اس لڑائی میں درگاوتی کا بیٹا دیرنارائن مارا گیا۔ اس حادثہ سے رانی کے ہوش خطا کرنے لگے وہ تیش میں آکر فوج کے جھرمٹ میں گھس کر دشمن پر وار کرتی رہی، اچانک رانی کی آنکھ میں تیر بیٹھ گیا تیر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ دشمن کے سپاہی نے رانی کے سینہ میں خنجر بھالا گھوپ دیا، جس سے وہ تاب نہ لاسکی اور بے ہوش زمین پر گر پڑی۔ اس طرح آصف خاں کو کامیابی ملی۔

اس طرح رانی درگاوتی نے ملک اور قوم کے لیے اپنے کو قربان کر دیا۔ اور تاریخ کی کتابوں کے صفحوں میں اپنی جاں نثاری کی داستان چھوڑ گئی۔

راخی مرگ نینی

مرگ نینی گجرات کے شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہ بہت ہی حسین و

جمیل خاتون تھی، اس کی آنکھیں آہو مثال تھیں، اسی لیے اس کو مرگ نبی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ گجرات کے راجہ مان سنگھ کی رانیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت رانی تھی اسی لیے راجہ اس سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ افسوس کہ مرگ نبی کے والدین کے حالات کے بارے میں مورخین خاموش ہیں۔

مرگ نبی تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی اور شمشیر زنی، تیر اندازی، گھڑ سواری میں مکمل مہارت رکھتی تھی وہ بہت ہی نیک سیرت رانی تھی اور صورت کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ”اندھیرے میں بیٹھ جائے تو اچالا ہو جائے۔ رانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے علم موسیقی میں کمال حاصل تھا جس وقت وہ گاتی تھی انسان تو کیا حیوان اور پرندے بھی مبہوت ہو جاتے تھے، تان سین اس زمانے یعنی اکبری عہد کا عالمی شہرت کا راگ داں اور ساز نواز تھا۔ اس زمانے میں تان سین سے بڑا اور کوئی موسیقار نہیں تھا، تان سین پہلے برہمن تھا اور وہ بعد میں اپنی مرضی کے مطابق مسلمان ہو گیا تھا، اس کے گرد معروف موسیقار سادھو مہری تھے۔

”تان سین نے جب مرگ نبی کے گانے اور آواز کی تعریف سنی تو رانی کی خدمت میں حاضر ہوا، رانی سے جب گانا سنا تو تصویر حیرت بن گیا اور اپنی باقی ماندہ زندگی تان سین نے گواپار میں ہی گزار دی۔ تان سین کی قبر گواپار کے قلعہ میں اب بھی موجود ہے۔“

مصنف آگے تحریر کرتا ہے کہ مرگ نبی نے اپنے راگ کے ذریعہ کئی لا علاج مریضوں کو ٹھیک کیا اور رانی کا یہی دعویٰ تھا۔ موسیقی کے ذریعہ لا علاج مریض بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں، رانی نے اپنے راگ کے ذریعہ گجرات کے رہنے والے اپنے ایک عزیز اور ایک مجبور بوڑھی عورت کے لڑکے کا علاج کیا تھا۔

لے بحوالہ، رانیاں اور شہزادیاں۔ از خان محمد حسین خاں ص ۱۹۸

رانی میرا بانی

میرا بانی کا نام ہند کی مایہ ناز خواتین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ پال دامن مقدس اور نیک سیرت خاتون ہر وقت بھگوان کرشن کی عقیدت میں ڈوبی رہتی تھی۔ اسی لیے اس کو پریم بھگتنی کے نام سے تاریخ ہند یاد کرتی ہے۔

میرا بانی راجہ جمیل کی چہنی اور لاڈلی بیٹی تھی جو مارواڑ کے معروف راجہ تھے۔ میرا بانی کی زندگی پر اس کی والدہ جو بہت ہی مذہبی خیال کی خاتون پر اس کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے بچپن سے ہی اس کی والدہ مذہبی رسومات میں میرا بانی کو اپنے ساتھ رکھتی تھی جس کی وجہ سے میرا بانی دنیا کے ہر عیش و آرام سے بے نیاز ہوتی چلی گئی۔ میرا بانی ہر وقت کرشن پوجا میں ڈوبی رہتی تھی اور یہی پوجا اس کی زندگی کا مقصد حیات بن گیا، دھیرے دھیرے وہ اپنے عہد کی ایک عظیم فقیرہ بن گئی۔ اب دنیا کی اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی ہر وقت اس کی زبان پر یہی راگ کہ:

” مائی مو کو سو پن میں ہرنی گو پال “

میرا بانی کا یہ راگ تمام ملک میں شہور ہو گیا۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی دنیا کا کوئی عیش و آرام اس کو اپنی طرف نہ لاسکا۔ میرا بانی جب جوان ہوئی تو رانا کنبھ (بھوج راج یعنی رانا سانگا کے بڑے بیٹے) سے اس کی شادی کر دی گئی۔ شوہر کی بھی ہر کوشش اس کو دنیا کی طرف لانے میں ناکام رہی، آخر میں شوہر کو میرا بانی سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگنی پڑی۔

ایک مرتبہ میرا جب ایک مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی تو رانا کنبھ فقیروں کے لباس میں میرا کی خدمت میں پہنچا اور کہا ” مجھے کبھی کچھ دو “ میرا نے جواب دیا مہانتا میں تو خود فقیر ہوں تم کو میں کیا دے سکتی ہوں، رانا نے معافی مانگی دونوں کچھ دیر تک روتے رہے آخر میں رانا نے کہا کہ تم گھر چلو اس نے منظور کر لیا پھر



دم ینتی

کبھی رانا نے میرا بانی کے کام میں دخل اندازی نہیں کی۔ میرا ہر وقت بھجن گاتی رہتی تھی اور گاتے گاتے بے ہوش ہو جاتی تھی، ایک روز وہ روحانی باغ کی کوئل "حقانی راگ" گاتی اڑ گئی۔

رانی نیل دیوی

نیل دیوی پنجاب کے راجہ سورج دیو کی رانی تھی، اسے قدرت نے فیاض ہاتھوں سے نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ جب عبدالشرف سورشاہ دہلی کے سپہ سالار نے پنجاب پر حملہ کر کے راجہ سورج دیو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سپہ سالار دہلی نے نیل دیوی کے ذوقِ موسیقی اور سُرِ ملی آواز کے بارے میں بہت شہرت سنی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ نیل دیوی کی آواز میں جادو کا اثر تھا۔

راجہ سورج دیو کی موت کے بعد سپہ سالار نے نیل دیوی سے اس کا گانا سننے کے لیے بار بار خواہش ظاہر کی تو رانی نے خنجر سے عبدالشرف کا سر تن سے جدا کر دیا اور خود بھی ہزار داستان سناتے ہوئے خاک کا ڈھیر ہو گئی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی وہ خاموش ہے لیکن زمانہ اب تک اس کے گیت گارہا ہے۔

رانی دمیتی

دو آبہ دیس پہلے برار کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ دمیتی دو آبہ دیس کے راجہ بھیم کی خوبصورت بیٹی تھی۔ دمیتی "پرستان" کی پری کے نام

سے بحوالہ :- رانیاں اور شہزادیاں، از : خاں محمد حسین خاں صاحب

سے مشہور تھی۔ دہشتی کی شادی نل سے ہوئی تھی۔ دہشتی تاریخ میں اپنی پاکدہنی کے لیے مشہور تھی۔

ایک دفعہ دہشتی اور اس کے شوہر نل کو مصائب کی گھٹاؤں نے گھیر لیا اور گردشِ دوراں نے ایسا امتحان لیا کہ شوہر اور بیوی دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور تین سال تک الگ الگ بھٹکتے پھرے مگر اس عفت مآب وطن کی پاکدامن خاتون نے اپنے دامن پر کوئی داغ نہیں آنے دیا۔ اور اس دوران تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ زندگی بسر کی۔

ماخذ

۲۰۳

| نمبر شمار | نام کتاب | مصنف | اشاعت |
|-----------|--------------------------|----------------------------|-------------------------------|
| ۱ | تاریخ جہانگیر | ڈاکٹر بینی پرشاد | ترقی اردو بورڈ نئی دہلی |
| ۲ | تاریخ شاہجہانی | ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ | " |
| ۳ | حیات نور جہاں | نواب عماد نواز جنگ | مصطفائی پریس، لاہور |
| ۴ | شہزادہ بابر | احمد جان | اردو اخبار پریس، لاہور |
| ۵ | زیب النساء بیگم | مولانا شبلی | نول کشور پریس، لاہور |
| ۶ | سوانح زیب النساء بیگم | مولوی عاشق حسین | ابوالحلائی پریس آگرہ |
| ۷ | حیات النساء | منشی محمد دین خلیق | اخبار پریس، لاہور |
| ۸ | گلبدن بیگم | سعید الدین حسن شارق | فاروقی پریس، دہلی |
| ۹ | ہمایوں نامہ (گلبدن بیگم) | مترجم، عثمان حیدر مرزا | مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ |
| ۱۰ | گلبدن بیگم | سعید الدین حسن، بی اے | خواجہ پریس، دہلی |
| ۱۱ | دختران ہند | مولانا محمد علم الدین سالک | امرت پریس، لاہور |
| ۱۲ | تذکرہ نسواں ہند | اخبار وطن | " |
| ۱۳ | شاہان مغلیہ کی بیویاں | مراد مارہروی | حیدریہ پریس، دہلی |
| ۱۴ | زیب النساء بیگم | امراؤ مرزا حیرت | مہمور پریس، دہلی |
| ۱۵ | جہاں آرا بیگم | مولوی محبوب الرحمن کلیم | فیض عام اردو ہند پریس علی گڑھ |
| ۱۶ | بیگمات خاندان تیموریہ | سید ظہور الحسن | قومی پریس، دہلی |
| ۱۷ | نور جہاں | مرزا حیرت علی دہلوی | صدیقی پریس، دہلی |

- | | | |
|-------------------------------------|------------------------------|--------------------------|
| ۱۸۔ ہندوستان کی بہادر عورتیں | ایوان اشاعت گورکھپور | ملت پریس گورکھپور |
| ۱۹۔ آب حیات | محمد حسین آزاد (احتشام حسین) | بڑی پریس، دہلی |
| ۲۰۔ بزم نیموریہ | سید صباح الدین | معروف پریس، اعظم گڑھ |
| ۲۱۔ عالم نسواں | راشد الخیری | محبوب پریس، دہلی |
| ۲۲۔ آثار الصنادید | سر سید احمد خاں | نول کشور پریس لکھنؤ |
| ۲۳۔ الرحلہ | ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) | مولوی محمد حسین، لاہور |
| ۲۴۔ مطلع الانوار اور عجائب الاسفار | خواجہ امیر خسرو | پرنٹنگ پریس علی گڑھ |
| ۲۵۔ اسلامی نظام اور عورت کا مقام | مائل خیر آبادی | مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی |
| ۲۶۔ اقبال نامہ جہانگیری | ذکر یا مائل محمد | سمتا پریس لکھنؤ |
| ۲۷۔ شہزادی زیب النساء | انتظام اللہ شہابی | مرتضیٰ پریس، دہلی |
| ۲۸۔ مقالات شبلی | مولانا شبلی | اعظم گڑھ |
| ۲۹۔ تاریخی مقالات | خلیق احمد نظامی | بندۃ المصنفین، دہلی |
| ۳۰۔ سوانح دہلی | شہزادہ احمد مرزا | افتخار پریس، دہلی |
| ۳۱۔ فیصلہ التواریح اودھ | سید کمال الدین احمد | نول کشور پریس لکھنؤ |
| ۳۲۔ تاریخ دہلی | کپور چندر پرکاش چند پبلشرز | سمتی پریس، دہلی |
| ۳۳۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں | محمد میاں مولانا سید | یونین پریس دہلی |
| ۳۴۔ بیگمات اودھ | تصدق حسین شیخ | سرفراز پریس لکھنؤ |
| ۳۵۔ دہلی تاریخ کے آئینہ میں | خلیق احمد نظامی | یونیورسٹی پریس، دہلی |
| ۳۶۔ رانیاں اور شہزادیاں | خان احمد حسین خاں | ایجوکیشن پریس، لاہور |

| | | |
|-----------------------|--------------------------|-------------------------------------|
| ۳۷۔ مطلع الانوار | خواجہ امیر خسرو | مطبع مسلم یونیورسٹی |
| ۳۸۔ دیول رانی خضر خاں | خواجہ امیر خسرو | مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ |
| ۳۹۔ تاریخ داودی | عبداللہ | تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید علی گڑھ |
| ۴۰۔ منتخب التواریخ | ملا عبدالقادر بدایونی | ایشیا نیک سوسائٹی کلکتہ |
| ۴۱۔ آئین اکبری | ابوالفضل | مترجمہ سید احمد خاں دہلی |
| ۴۲۔ آداب الحرب | فخر مدبر | قلمی نسخہ |
| ۴۳۔ طبقات ناصری | منہاج الدین سراج | ایشیا نیک سوسائٹی |
| ۴۴۔ تاریخ فرشتہ | محمد قاسم | نول کشور |
| ۴۵۔ تاریخ فیروز شاہی | ضیاء الدین برنی | ایشیا نیک سوسائٹی |
| ۴۶۔ اعجاز خسروی | خواجہ امیر خسرو | مطبع نول کشور |
| ۴۷۔ اکبرنامہ | ابوالفضل | ایشیا نیک سوسائٹی |
| ۴۸۔ قرآن السعیدین | خواجہ امیر خسرو | مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ |
| ۴۹۔ تاریخ مبارک شاہی | یحییٰ بن احمد سربندی | ایشیا نیک سوسائٹی |
| ۵۰۔ بابرنامہ | بابر | انگریزی ترجمہ مسز بیورج لندن |
| ۵۱۔ خزائن الفتوح | امیر خسرو | علی گڑھ پرنٹنگ پریس |
| ۵۲۔ مؤنس الارواح | جہاں آرا بیگم | قلمی نسخہ |
| ۵۳۔ ہندوستانی معاشرہ | کنور محمد اشرف | ترجمہ: ترقی اردو بورڈ نئی دہلی |
| عہدہ وسطیٰ میں | | |
| ۵۴۔ جہاں آرا بیگم | ضیاء الدین احمد برنی | تعلیمی مرکز، کراچی |
| ۵۵۔ گلبدن بیگم | پروفیسر سید ابن حسن شارق | دفتر خاتون مشرق، دہلی |



مصنّف

تاریخی صدافتوں پر مبنی تحقیقی تصانیف



* عہدِ وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی

* دارا شکوہ

* جنرل بخت خان

* نعل شہزادیاں

* عظمتِ ہندوستان اور عہدِ وسطیٰ

(زیر طباعت)

ملنے کا پتہ

محمود یہ پبلک اسکول، چوہان بانگر، نیو سلیم پور دی